شذرات

صبر اور شکر کی آزمایش	خورشید احمد ندیم	۲

قرآنیات

النساء (۴: ۱۱)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

بہتر اسلام	طالب محسن	۱۳
قریش کے بارے میں ایک روایت	معز امجد	۱۷
کیا گوہ حرام ہے؟	ساجد حمید	۱۹

دین و دانش

ایمانیات (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۳۱

نقطۂ نظر

چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن'' (۵)	پروفیسر خورشید عالم	۳۷

سیر و سوانح

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۶)	محمد وسیم اختر مفتی	۵۷

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خورشید احمد ندیم

صبر اور شکر کی آزمایش

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

برادر عزیز سید منظور الحسن کو پیش آنے والا حادثہ، ہمارے لیے صبر اور شکر، دونوں آزمایشیں ایک ساتھ لے کر آیا۔ جان لینے کی انتہائی انسانی کوشش اگر صبر کی متقاضی تھی تو جان بچانے کا غیر معمولی الٰہی اہتمام شکر کا ایک عظیم موقع تھا۔ صبر اور شکر، دونوں اللہ تعالیٰ کی توفیق کے محتاج ہیں اور آخرت کی کامیابی انھی لوگوں کا مقدر ہے جن کے لیے یہ توفیق ارزاں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی احسان ہے کہ اس نے دل گرفتگی اور پریشانی کے لمحات کو اپنے کرم سے مختصر کر دیا اور ہمارے رفیق کا ایک قدم اگر موت کی دہلیز پر تھا تو دوسرا زندگی کے آنگن میں۔ بلا شبہ وہ اس پر قادر ہے کہ زندگی سے موت اور موت سے زندگی کو جنم دے۔ اس حادثے کا یہ پہلو تو وہ ہے جو منظور صاحب سے قرب رکھنے والوں سے متعلق ہے۔ اس کے دوسرے پہلو کا تعلق ہماری اجتماعی زندگی سے ہے اور ہم اسی جانب سماج کے دردمند افراد کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں جو مسائل نسبتاً جدید ہیں اور جن سے ہمارے اجتماعی وجود کو شدید خطرات لاحق ہیں، ان میں مذہبی معاملات میں اختلاف کے عدم برداشت کا مسئلہ سب سے سنگین ہے۔ یہ نصوص کی تاویل کا معاملہ ہو یا ان سے استنباط احکام کا، اگر کوئی ہم سے مختلف الخیال ہے تو ہمارے نزدیک اس کا ایمان معتبر ہے نہ اس کا اخلاص۔ مذہبی قیادت کے مختلف درجات پر فائز حضرات اپنے متعلقین کو یہ بتاتے ہیں کہ ان سے مختلف رائے یا موقف رکھنے والے حضرات کا وجود دین کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے اور وہ امت کے لیے ایک فتنہ ہیں۔ یہ بات یہاں پر تمام نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہا جاتا ہے کہ اس فتنے کی ''سرکوبی'' علما اور اہل حق کی ذمہ داری ہے۔ ان حضرات کی تحریر و تقریر کا مخاطب اس

''سرکوبی'' کا مفہوم متعین کرنے میں آزاد ہے۔ وہ اگر اس کے لفظی مفہوم ہی کو درست سمجھتا ہے تو کلام کے سیاق و سباق یا اسلوب میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جو اس تاویل میں مانع ہو۔ بعض گروہوں کے ہاں یہ معاملہ چند قدم مزید طے کر چکا اور انھوں نے بعض مسلمانوں کے قتل کے فتوے بھی دے رکھے ہیں۔

اگر ہم نے اس مسئلے کو ایک جدید مسئلہ قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ابتدائی دور میں بالخصوص اور بعد کے ادوار میں چند مستثنیات کے ساتھ بالعموم صورت حال یہی رہی کہ نصوص کی تاویل اور ان سے احکام اخذ کرنے میں لوگوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور معاشرے نے اس طرز عمل کو نہ صرف روا رکھا، بلکہ ایسے اختلافات کبھی باہمی احترام میں بھی رکاوٹ نہیں بنے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے رخصتی کے وقت سیدنا عمر فاروق نے اگر ایک مختلف موقف اختیار کیا تو اس کی وجہ محض جذبات نہیں تھے، بلکہ ان کے نزدیک یہ معاملہ ایک آیت کی تاویل کا تھا۔ سورۂ بقرہ کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (۲:۱۴۳)	''اور اس طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت بنایا تاکہ تم لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دے۔''

حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ سیدنا عمر فاروق نے اپنے دور خلافت میں ان سے فرمایا: ''آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت میں نے جو کچھ کہا، اس کا سبب کیا تھا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے سورۂ بقرہ کی اس آیت کا حوالہ دیا اور کہا کہ میں یہ خیال کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت میں اسی طرح موجود رہیں گے حتیٰ کہ اس کے آخری عمل کی بھی شہادت دیں۔ (سیرت ابن ہشام) گویا سیدنا عمر فاروق نے اس آیت میں شہادت کو عینی شہادت سے تعبیر کیا اور اسی وجہ سے انھوں نے یہ بات ماننے سے انکار کیا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا سکتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر کی تقریر سے وہ اس آیت کا صحیح مفہوم جان سکے۔ اس نوعیت کے کئی واقعات نقل کیے جا سکتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام میں آیات کے مفاہیم طے کرنے میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ یہی معاملہ ارشادات پیغمبر علیہ السلام کی تاویل کا بھی ہے۔ جہاں تک استنباط احکام کا تعلق ہے تو اس میں موجود اختلافات پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر امام ابن تیمیہ نے بیان کیا ہے کہ ایک سو کے قریب ایسے مسائل تھے جن میں سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عبداللہ ابن مسعود ایک دوسرے سے مختلف آرا رکھتے تھے۔ یہ اختلافات بعد کے ادوار میں بھی قائم رہے اور تبع تابعین کے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

دور میں کم از کم تیرہ فقہی مسالک موجود تھے۔

ان تمام ادوار میں ان اختلافات کو نہ صرف گوارا کیا گیا، بلکہ ان کی وجہ سے باہمی احترام اور مودت کے جذبات میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہمارے اسلاف کے ہاں اس طرح کی کوئی روایت موجود نہیں ہے کہ اختلاف کی بنا پر دوسرے کے خلاف عوام کے جذبات بھڑکائے گئے ہوں یا ان کے متعلق فتوے دیے گئے ہوں۔ اس معاملے میں ان کی احتیاط کا جو عالم تھا، اس کا اندازہ خوارج کے معاملے میں امیرالمومنین سیدنا علی کے طرز عمل سے کیا جا سکتا ہے۔ عقیدے اور سیاسی موقف، دونوں اعتبارات سے انھوں نے جو موقف اختیار کیا، اس کے بعد اگر اسلامی حکومت خوارج کے خلاف اقدام کا فیصلہ کرتی تو اس کا جواز موجود تھا، لیکن اس کے باوجود سیدنا علی کا موقف یہ تھا کہ اپنے ان خیالات کے باوجود اگر وہ اسلامی حکومت کے خلاف جنگ نہیں کرتے تو ان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی جائے گی۔ ان کے اقدام کے نتیجے میں امیر المومنین کی شہادت ہوئی، لیکن انھوں نے ان کے خلاف تلوار استعمال نہیں کی، بلکہ حضرت ابن عباس نے ان کے ساتھ گفتگو کی اجازت چاہی تو حضرت علی نے اس سے منع نہیں کیا۔ ابن عباس اور خوارج کا مکالمہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے اور اسے ابن قیم نے ''اعلام الموقعین'' میں بھی نقل کیا ہے۔ گویا یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس امت میں نصوص کی تاویل اور فقہی اختلاف سے لے کر سیاسی اختلاف تک، ہر دوسری رائے کو گوارا کیا گیا۔ یہ بات تو کبھی اختلافی نہیں رہی کہ اگر کسی گروہ یا فرد کے خلاف کسی وجہ سے کوئی اقدام ناگزیر بھی ہے تو اس کا حق صرف ریاست کو ہے۔ یہ بات ہمارے اسلاف کے کبھی حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ بغیر اقتدار کے کسی کی جان لینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اسے ایک جدید مسئلہ کہتے ہیں جس کے تحت افراد اور گروہ مذہبی اختلاف کی بنیاد پر دوسروں کے خلاف اقدام کی ترغیب دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک کسی فرد یا گروہ کے ساتھ اگر اختلاف ہو جائے، قطع نظر اس کے کہ وہ اصولی ہے یا فروعی، اپنی حقیقت میں مذہبی ہے یا سیاسی، تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اہل علم کی جو ذمہ داری بیان ہوئی ہے، وہ انذار ہے۔ (التوبہ ۹: ۱۲۲) اس انذار کی حکمت عملی بھی قرآن نے بیان کی ہے جس کی تفصیل نکات کی صورت میں کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے:

۱۔ اگر آپ کے نزدیک کسی فرد یا گروہ کی رائے کسی معاملے میں غلط ہے تو آپ اس تک اپنی بات اچھے اسلوب میں اور حکمت کے ساتھ پہنچائیں۔ ارشاد ہوا: ''اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو اور

اچھی نصیحت کے ساتھ اوران سے بحث کرو، اس طریقے سے جو پسندیدہ ہو۔'' (النحل ۱۶: ۱۲۵)

یعنی اگر آپ کے موقف میں ایک طرف دلائل و براہین ہوں تو دوسری طرف دردمندی اور نصیحت کا جذبہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر معاملہ بحث ومباحثے تک جا پہنچے تو بھی شایستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

۲۔ انذار کی نوعیت یہ ہے کہ یہ کام صرف دعوت تک محدود ہے۔ اگر ایک آدمی نے کسی دوسرے فرد کے بارے میں یہ خیال کیا کہ وہ ایک غلط موقف پر قائم ہے تو وہ اس تک اچھے اسلوب میں اپنی بات پہنچا دے۔ اس کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کے افکار سے کوئی عمومی گمراہی پیدا ہو رہی ہے، تو وہ ابلاغ کے ہر ذریعے کو استعمال کرتے ہوئے عامۃ الناس کو وہ بات پہنچا سکتا ہے جو اس کے خیال میں صحیح ہے۔ اس کے بعد اس کی ذمہ داری تمام ہو جاتی ہے۔ اس کے آگے بڑھ کر وہ کوئی اقدام کرتا، لوگوں میں اشتعال پیدا کرتا اور فساد کی کیفیت کو جنم دیتا ہے تو بلا شبہ یہ اپنی حدود سے تجاوز ہے جس کا کوئی حق اسے حاصل نہیں ہے۔ لوگوں کی زندگی، موت اور آخرت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کو کرنا ہے اور اس میں مداخلت جتنا سنگین جرم ہے، اس کا اندازہ دین کے ہر طالب علم کو اچھی طرح ہونا چاہیے۔

قرآن مجید نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ. (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

''تم یاد دہانی کر دو، (اے پیغمبر) تم بس یاد دہانی کرنے والے ہی ہو، تم ان پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ. (الرعد ۱۳: ۴۰)

''سو تم پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے اور (ان کا) حساب تو ہمیں ہی لینا ہے۔''

آج ہم نے مذہبی اختلافات کو جس سطح تک پہنچا دیا ہے اور ہماری مذہبی قیادت نے جس طرح دعوت کے منصب کو چھوڑتے ہوئے ''فتنوں کی سرکوبی'' کو اپنا مشن قرار دیا ہے، اس سے واقعہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عدم برداشت کا کلچر پیدا ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں جہاں خود مذہب کے لیے منفی جذبات پروان چڑھے ہیں وہاں معاشرتی امن بھی شدید خطرات کی زد میں ہے۔ آج ہماری مذہبی قیادت کی بدرجۂ اولیٰ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ صورت حال کی شدت کو محسوس کرے اور آگے بڑھ کر وہ فضا پیدا کرنے کی سعی کرے جس میں تاویل اور تشریح کے اختلاف کو گوارا کیا جائے اور اس بنیاد پر کسی کو قابل گردن زدنی قرار نہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ اس سماج کے دردمند

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لوگوں کو بھی سوچنا ہو گا کہ اس معاشرے میں لوگوں کے جان و مال کا تحفظ کیسے ممکن ہے۔ دیگر امور کے ساتھ اس بات کو بہرطور ہمیں ایک بنیاد کے طور پر پیش نظر رکھنا ہو گا کہ کسی انسان کی جان لینا اسلام میں ایک شدید جرم ہے اور اگر کسی حق کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہے تو اس کا اختیار بھی صرف اور صرف نظم اجتماعی یعنی ریاست کو حاصل ہے۔

برادر عزیز سید منظور الحسن کو پیش آنے والا حادثہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ نہیں ہے۔ ایسا ہر حادثہ ہمیں اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ اس معاشرے کو فساد سے بچانا حیات اجتماعی کے لیے کتنا ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگوں میں اختلاف رائے کے ساتھ جینے کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com

یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ، لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ، فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ، وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ.

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے[۱۹] کہ اُن میں سے لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔[۲۰] پھر اگر اولاد میں لڑکیاں ہی ہوں اور وہ (دو یا) دو سے زیادہ ہوں[۲۱] تو اُنھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اُس کے لیے آدھا ہے۔[۲۲]

---

[۱۹] اصل الفاظ ہیں: 'یوصیکم اللّٰه فی اولادکم'۔ ان سے واضح ہے کہ آگے جو حصے بیان ہوئے ہیں، انھیں اللہ نے اپنی وصیت قرار دیا ہے۔ اس کے بعد، ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان اس کے مقابلے میں اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

[۲۰] یہ حکم اگر اسی جملے پر ختم ہو جاتا تو اس کے معنی یہ تھے کہ مرنے والے کی اولاد میں اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہی ہو تو لڑکے کو لڑکی سے دونا ملے گا؛ لڑکے اور لڑکیاں اس سے زیادہ ہوں تو میت کا ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رہے؛ اولاد میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہوں تو سارا ترکہ دونوں میں سے جو موجود ہوگا، اسے دیا جائے گا۔ لیکن حکم یہاں ختم نہیں ہوا، بلکہ اس سے متصل اگلے ہی جملے میں ایک استثنا کے ذریعے سے قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں تو سارا ترکہ ان میں تقسیم نہیں ہوگا۔

وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ، اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ، فَاِنۡ لَّمۡ

لیکن ترکے کا چھٹا حصہ، (اِس سے پہلے) میت کے والدین میں سے ہر ایک کو ملنا چاہیے[23]، اگر اُس کی اولاد ہو[24]۔ اور اگر اولاد نہ ہو اور والدین ہی اُس کے وارث ہوں تو تیسرا حصہ ماں کا ہے (اور باقی

ایک ہی لڑکی ہو تو اسے ترکے کا نصف اور دو یا دو سے زیادہ ہوں تو انھیں دو تہائی دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قانون لوگوں کے جذبات پر نہیں، بے لاگ انصاف پر مبنی ہے۔ لڑکی کی منفعت والدین کے لیے لڑکے سے کم ہوتی ہے، اس لیے کہ شادی کے بعد اس کی منفعت بیشتر اس کے شوہر اور شوہر کے گھر والوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسی بنا پر لڑکے سے اس کا حصہ آدھا رکھا ہے اور اولاد میں صرف لڑکیاں ہوں تو ان کا حصہ کم بھی کر دیا ہے۔

[۲۱] اصل میں 'فوق اثنتین' (دو سے زیادہ) کے الفاظ آئے ہیں، لیکن ان کا مفہوم ہم نے دو یا دو سے زیادہ بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'فوق اثنتین' سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ عربیت کے قاعدے سے حذف ہو گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں اگر ہم ایک لڑکی اور دو یا دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ ان کے حصوں میں فرق کی وجہ سے الگ الگ بیان کرنا چاہیں تو اس کے دو طریقے ہیں: ترتیب صعودی کے مطابق بیان کرنا پیش نظر ہو تو پہلے ایک لڑکی اور اس کے بعد دو لڑکیوں کا حصہ بیان کیا جائے گا۔ دو سے زائد کا حصہ اگر وہی ہے جو دو کا ہے تو اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کے فوراً بعد جب دو کا حصہ اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ایک کے حصے سے زیادہ ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔ اسی بات کو ہم ترتیب نزولی کے مطابق بیان کریں گے تو اس کے لیے 'فوق اثنتین او اثنتین' کے الفاظ چونکہ عربیت کی رو سے موزوں نہ ہوں گے، اس لیے دو سے زائد کا حصہ بیان کرنے کے بعد ایک کا حصہ بیان کر دیا جائے گا۔ اس اسلوب میں 'فوق اثنتین' سے کلام کی ابتدا خود دلیل ہو گی کہ اس سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ محذوف ہے۔ اس کا قرینہ بھی واضح ہے۔ اس ترتیب کا حسن مقتضی ہے کہ 'فوق اثنتین' سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے اور صحت زبان کا تقاضا ہے کہ 'فوق اثنتین' سے بات شروع کی جائے تو بعد میں 'اثنتین' مذکور نہ ہو۔ قرآن مجید نے یہ حصے یہاں ترتیب نزولی کے مطابق بیان کیے ہیں، اس لیے حذف کا یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ سورۂ نساء کی آخری آیت میں یہی حصے ترتیب صعودی کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہاں 'اثنتین' کے بعد 'فوق اثنتین' کا لفظ حذف کر دیا ہے: 'اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ، فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ، وَهُوَ يَرِثُهَاۤ، اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ، فَاِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ، فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ'*۔

---

*۴:۱۷۶۔

يَـكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ، وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ، فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ، فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ، فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ.

باپ کا[۲۵])۔ لیکن بھائی بہن ہوں[۲۶] تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے[۲۷] (اور باپ کے لیے بھی وہی چھٹا حصہ)۔ یہ حصے اُس وقت دیے جائیں، جب وصیت جو اُس نے کی، وہ پوری کر دی جائے[۲۸] اور قرض، (اگر ہو تو) ادا کر دیا جائے۔

---

[۲۲] یہ جملہ پچھلے جملے سے استثنا ہے، اس لیے اس کا حکم بھی وہی ہو گا جو پچھلے جملے کا ہے یعنی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں ترکے کے اسی حصے کا دو تہائی یا نصف دیا جائے گا جو اگر تنہا لڑکے ہوتے تو ان میں تقسیم کیا جاتا۔ وہ پورے ترکے کے دو تہائی یا نصف کی حق دار نہ ہوں گی۔ 'فان کن نساء' پر اصل میں جو حرف 'ف' اور 'و لابویه' سے پہلے حرف 'و' آیا ہے، وہ اسی پر دلالت کرتا ہے۔

[۲۳] یہ جملہ اس سے متصل پہلے لڑکیوں کے حصوں پر نہیں، بلکہ اس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ اس کا عطف اب استدراک کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا، لیکن یہ کتنا ہو گا، اسے متعین نہیں کیا گیا۔ چنانچہ والدین اور زوجین کے جو حصے اس کے بعد آئے ہیں، وہ لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہو گا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو انھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو ان کے لیے بھی یہی قاعدہ ہو گا۔ اسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہوں تو انھیں بھی اس بچے ہوئے ترکے ہی کا نصف یا دو تہائی دیا جائے گا۔ اس کے لیے 'فان کن نساء' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، ان کے بارے میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ یہ 'للذکر مثل حظ الانثیین' سے استثنا اور اسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہیں، ان کا حکم اس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

[۲۴] اصل میں 'ان کان له ولد' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'ولد' کا لفظ ذکور و اناث، دونوں کے لیے ہے۔ یہاں اور اس کے بعد ازواج کے حصوں میں بھی ہر جگہ اس کا مفہوم یہی ہے۔ لڑکا لڑکی ایک ہوں یا دو، اولاد میں صرف لڑکے ہوں یا صرف لڑکیاں ہوں، نفی و اثبات میں اس شرط کا اطلاق لازماً ہو گا۔

[۲۵] یہ الفاظ یہاں حذف ہیں۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ـــــ ''اس رقم کے وارث زید اور علی ہی ہوں تو زید کا حصہ ایک تہائی ہو گا'' ـــــ تو اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ـــــ ''باقی دو تہائی علی کے لیے ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اٰبَـآؤُكُـمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ، لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴿١١﴾

تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بہ لحاظ منفعت تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے (اِسی بنا پر) اللہ نے مقرر کر دیے ہیں۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔[۲۹] ۱۱

[۲۶] اصل میں لفظ 'اخوة' استعمال ہوا ہے۔ یہ جمع ہے، لیکن اس طرح کے اسلوب میں جمع بیان عدد کے لیے نہیں، محض بیان وجود کے لیے آتی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں، عام اس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو، یا دو سے زیادہ ہوں، والدین کا حصہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے گا۔

[۲۷] اصل الفاظ ہیں: 'فان كان له اخوة، فلامه السدس'۔ ان کے بعد بھی 'و لابيه' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اس میں جملوں کی تالیف اس طرح ہے: ''اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ۔ اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کے لیے تہائی، لیکن اگر بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ۔'' اس میں دیکھ لیجیے، کلام خود پکار رہا ہے کہ ــــ ''اور باپ کے لیے بھی وہی چھٹا حصہ۔'' اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اولاد کی عدم موجودگی میں ان کا حصہ اب بھائی بہنوں کو ملنا چاہیے۔ یہ اشارہ واضح تھا، لیکن قرآن کے مخاطبین جب اس کو نہیں سمجھ سکے تو اس نے وضاحت فرما دی۔ یہ وضاحت اسی سورہ کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

[۲۸] اس سے واضح ہے کہ وصیت کا حق باقی ہے، لیکن قرآن نے اس کے ساتھ آگے 'غیر مضار' کی شرط لگا دی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وصیت اتنی ہونی چاہیے جس سے وارثوں کی حق تلفی نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر نصیحت فرمائی ہے کہ یہ تہائی مال تک محدود رہے تو بہتر ہے۔

[۲۹] سلسلۂ کلام کے بیچ میں یہ آیت جس مقصد کے لیے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ جن رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے، ان کے بارے میں مبنی بر انصاف قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو محض رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھیرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا حق باقی نہیں رہا۔ ان کے لیے کوئی وصیت اب اگر وہ کرے گا تو صرف اس صورت میں کرے گا، جب ان میں سے کسی کی کوئی ضرورت یا اس کی کوئی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز اس کا تقاضا کرتی ہو۔ اس لیے کہ جس منفعت کے کم یا زیادہ ہونے کا علم اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے خاص قرار دیا گیا ہے، وہ رشتہ داری کی منفعت ہے۔ اس کا ان ضرورتوں

اور منفعتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ہمارے لیے معلوم اور متعین ہوتی ہیں۔

آیت کا اصل مدعا یہی ہے، لیکن اگر غور کیجیے تو اس سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح ہوگئی ہے کہ وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قرابت نافعہ ہے اور حصوں میں فرق کی وجہ بھی ان کے پانے والوں کی طرف سے مرنے والے کے لیے ان کی منفعت کا کم یا زیادہ ہونا ہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کا حصہ اسی بنا پر لڑکیوں سے اور شوہر کا بیوی سے دوگنا رکھا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ والدین، اولاد، بھائی بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھیرائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر مضرت بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علت حکم کا یہ بیان تقاضا کرتا ہے کہ اسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔

اسی طرح یہ رہنمائی بھی ضمناً اس آیت سے حاصل ہوتی ہے کہ ترکے کا کچھ حصہ اگر بچا ہوا رہ جائے اور مرنے والے نے کسی کو اس کا وارث نہ بنایا ہو تو اسے بھی 'اقرب نفعًا' ہی کو ملنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

"...یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم پیش و عقب، ہر چیز پر حاوی اور حاضر و غائب، سب پر محیط ہے۔ کسی کا علم بھی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کی ہر بات اور اس کے ہر کام میں نہایت گہری حکمت ہوتی ہے اور کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی حکمت کی تمام باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اس وجہ سے خدا کی اس تقسیم پر نہ تو اپنے علم و فلسفے کے غرے میں کسی کو معترض ہونا چاہیے، نہ جذباتی جنبہ داری کے جوش میں کسی کو کوئی قدم اس کے خلاف اٹھانا چاہیے۔ بسا اوقات آدمی اپنے ذاتی میلان کی بنا پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے، لیکن یہ ترجیح دنیا اور آخرت، دونوں ہی اعتبارات سے غلط ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی کو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر نظر انداز کرتا ہے، حالاں کہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ، دونوں ہی اعتبار سے اس کا رویہ زیادہ صحیح رہا جس کو اس نے نظر انداز کیا۔ پس صحیح روش یہی ہے کہ آدمی جو قدم بھی اٹھائے، اپنے ذاتی میلانات کے بجائے شریعت کی ہدایت کے مطابق اٹھائے۔ اسی میں خیر و برکت ہے۔ جو لوگ شریعت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں، وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں جس کی سزا بالعموم انھیں دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو بہر حال ملنی ہی ہے۔"

(تدبر قرآن ۲/۲۶۱)

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

بہتر اسلام

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

(مسلم، رقم ۳۹)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ.

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سا اسلام بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: تو کھانا کھلائے اور سلام کہے اسے بھی جسے تو جانتا ہے اور اسے بھی جسے تو نہیں جانتا۔''

لغوی مباحث

رجلا: کوئی آدمی۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ صحیح ابن حبان میں ان کا نام ہانی بن یزید (شریح کے والد) آیا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ ابوذر رضی اللہ عنہ تھے۔

ای الإسلام خیر: شارحین نے اس ترکیب میں 'خصال' کے لفظ کو مقدر مانا ہے۔ یعنی اسلام کی کون سی

خصال بہتر ہیں۔ دوسری روایات میں یہی سوال 'ای المسلمین خیر' کے لفظوں میں بھی پوچھا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں بھی اسلام بول کر مسلم ہی مراد ہے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں اسلام بول کر اس کے اعمال مراد لیے گئے ہوں۔ جیسے کہ اسی روایت کے ایک دوسرے متن میں یہ سوال 'ای الأعمال خیر' کے الفاظ میں منقول ہے۔

تطعم الطعام: تو کھانا کھلاتا ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ 'تو کھانا کھلائے' کیا ہے۔ امر کے محل پر فعل مضارع کا استعمال زیادہ بلیغ ہے۔ یہ اسلوب وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں کوئی وقتی حکم پیش نظر نہ ہو، بلکہ ایک مستقل خصلت کی طرف رہنمائی مقصود ہو۔

معنی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انسان کی شخصیت کئی دائروں میں گھری ہوئی ہے۔ یعنی انسان کی کئی حیثیتیں ہیں۔ اس کی ہر حیثیت میں کچھ اعمال خیر ہیں اور کچھ اعمال شر ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوع کی گفتگوؤں میں مخاطب کی ضرورت یا سوال کی رعایت سے انھی دائروں یا حیثیت کے اعتبار سے جواب دیے ہیں۔ زیر بحث روایت کے مکالمے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کے ایک دائرے کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہمارا انسانوں کے ساتھ تعلق کئی پہلوؤں سے قائم ہوتا ہے۔ یہاں ان میں سے عمومی میل جول کے حوالے سے دو چیزوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک ہر آدمی کو سلام کرنا اور دوسرے اپنے ملنے جلنے والوں کو کھانا کھلانا۔ پہلی چیز اسلامی شعار ہے۔ ہمارے دین میں یہ ادب مقرر کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی مسلمان دوسرے کو ملے گا تو اس کے لیے دنیا اور آخرت میں سلامتی کی دعا کرے گا۔ اس دعا کے الفاظ بھی مقرر ہیں۔ یعنی پہل کرنے والا 'السلام علیکم' اور جواب دینے والا 'وعلیکم السلام' کہتا ہے۔ دوسری چیز ملنے والے کی تواضع ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملنے والوں کو کھلانا پلانا درحقیقت ان سے ہمارے تعلق کے اظہار کی ایک صورت ہے۔ چنانچہ ہر تہذیب میں مہمان نوازی ایک قدر کی حیثیت سے جانی جاتی ہے اور اس کے برعکس رویہ رکھنے والے پسندیدہ قرار نہیں دیے جاتے۔ قرآن مجید میں ہر اس انسان کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی ہے جس کے ساتھ ہمارا تعلق قائم ہو گیا ہو اور خواہ یہ تعلق عارضی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو:

وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا،	''اللہ کی بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ بناؤ
وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا، وَّبِذِی الۡقُرۡبٰی،	اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور رشتہ داروں،

وَالْيَتٰمٰی، وَالْمَسٰکِیْنِ، وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ، وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ، وَابْنِ السَّبِیْلِ، وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا. (النساء۴: ۳۶)

یتیموں، فقیروں، قرابت مند پڑوسی، اجنبی پڑوسی، ہم پہلو، مسافر اور غلاموں کے ساتھ بھی۔ اس لیے کہ اللہ اترانے والوں اور بڑائی مارنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

اس آیۂ کریمہ کے آخری حصے میں اس کے برعکس رویے کے محرک کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ یعنی صرف وہ لوگ ہی حسن سلوک کرنے سے عاری رہتے ہیں جو اترانے والے اور بڑائی مارنے والے ہوں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسن سلوک وہی کر سکتا ہے جس میں تواضع ہو اور جو اپنے بارے میں کسی زعم میں مبتلا نہ ہو۔ وہ ہر حاصل کو اللہ تعالیٰ کی عنایت سمجھتا ہو اور دوسروں کو حقیر نہ جانتا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے سکھائے ہوئے اسی حسن سلوک کے دو مظہر اس روایت میں بیان کر دیے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں اس سوال کا جواب مثبت پہلو سے بیان کیا ہے۔ اسی نوع کے سوال کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا تھا: ’’مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔‘‘ اس جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز سے روکا ہے جسے بدسلوکی کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن سلوک کے منفی اور مثبت پہلو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گفتگوؤں میں بیان کیے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے یہی چند ارشادات روایت ہو سکے ہیں۔

اس روایت کے ضمن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا سلام کرنے میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق ہے۔ اس معاملے میں اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک انھی علما کی رائے قرین صواب ہے جو اس کی تخصیص نہیں مانتے۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ مسلمانوں کا شعار ہے۔ چنانچہ وہ ملنے ملانے کے موقع پر اپنے شعار کے مطابق ہی عمل کریں گے۔

متون

اس روایت کے متون میں بہت معمولی فرق ہیں۔ بعض روایات میں رسول کی جگہ نبی کا لفظ آیا ہے اور بعض میں الاسلام کی جگہ اعمال کا لفظ روایت ہوا ہے۔ البتہ اس سے ملتی جلتی ایک دوسری روایت بھی کتب روایت میں ملتی ہے۔ ہم یہاں اس کا پورا متن نقل کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عَـنْ عَبْـدِ الـلّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَـالَ: قَـالَ رَسُـوْلُ الـلّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَـلَّمَ: اعْبُـدُوا الـرَّحْـمٰـنَ، وَاَطْـعِمُوا الـطَّعَامَ وافْشُوا السَّلَامَ وادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ. (ترمذی، رقم ۱۸۵۵)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رحمان کی عبادت کرو، (لوگوں کو) کھانا کھلاؤ، سلام کو پھیلاؤ، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔''

کتابیات

بخاری، رقم ۲۸، ۱۲، ۵۸۸۲۔ مسلم، رقم ۳۹۔ ابوداؤد، رقم ۱۸۵۴۔ نسائی، رقم ۵۰۰۰۔ ترمذی، رقم ۱۸۵۴، ۱۸۵۵۔ ابن ماجہ، رقم ۳۲۵۳۔ احمد، رقم ۶۵۸۱، ۶۴۵۰، ۶۵۸۷، ۶۸۴۸۔ ابن حبان، رقم ۵۰۵۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۱۷۳۱۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

قریش کے بارے میں ایک روایت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایت کا مضمون

بیہقی، رقم ۵۰۸۰ کے مطابق بیان کیا جاتا ہے کہ

روی أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم قال: لا تعلموا قریشا، تعلموا منها . ولا تقدموا قریشا، ولا تأخروا عنها. فإن القرشی مثل قوة الرجلین من غیرهم.

”روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش کو سکھاؤ نہیں، بلکہ ان سے سیکھو، ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور نہ ان سے پیچھے رہو، کیونکہ قریش کا ایک آدمی دوسرے (قبیلے کے) دو آدمیوں کی طاقت کے برابر ہے۔“

یہ روایت بعض اختلافات اور اضافوں کے ساتھ عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۳ اور ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۳۸۶ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

روایت پر تبصرہ

امام بیہقی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

هذا مرسل وروى موصولا وليس بالقوی.

”یہ روایت مرسل[1] ہے۔ یہ متصل سند کے ساتھ بھی روایت ہوئی ہے، مگر وہ سند کمزور ہے۔“

نتیجۂ بحث

اس روایت کی سند کو امام بیہقی نے چونکہ مرسل قرار دیا ہے، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت کو قابل اعتماد نہ سمجھا جائے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ وترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

---

[1] مرسل ایک اصطلاح ہے جو حدیث کی اس سند کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس میں راوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کو سنا نہ ہو، مگر وہ اسے کسی واسطے کے بغیر براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہا ہو۔

ساجد حمید

کیا گوہ حرام ہے؟

—— ۲ ——

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انّ خالد بن الولید، الذی یقال له سیف اللّٰه، قال: انه دخل مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم علی میمونة، وهی خالته وخالة بن عباس، فوجد عندها ضبا محنوذا، قدمت به اختها حفیدة بنت الحارث من نجد. فقدمت الضب لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، وکان قلما یقدم یده لطعام حتی یحدث به ویسمی له.

فاهوی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یده الی الضب. فقالت امراة من النسوة الحضور: اخبرن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ما قد متن له. هو الضب یا رسول اللّٰه. فرفع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یده عن الضب.

فقال خالد بن الولید: احرام الضب یا رسول اللّٰه؟ قال: لا ولکن لم یکن بارض قومی فاجدنی اعافه.

قال خالد: فاجتررته فاكلته، ورسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ینظر الی[فلم ینهنی[2]].

''خالد بن ولید، جنھیں سیف اللہ کا لقب ملا، کہتے ہیں کہ ایک دن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے۔ جو خالد اور ابن عباس کی خالہ تھیں۔ ان کے پاس بھنی ہوئی گوہ (سوسمار) دیکھی جو انھیں ان کی بہن حفیدہ بنت حارث نے نجد سے بھیجی تھی۔ انھوں نے یہ گوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی۔ کم ہی ہوتا تھا کہ آپ کسی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں، اور آپ کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ کھانا کیسا ہے اور یہ کہ کیا پکا ہوا ہے۔

آپ نے اسے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو موجود خواتین میں سے کسی نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاؤ کہ تم نے کیا کھانے کو پیش کیا ہے۔ (لوگوں نے آپ کو بتایا) یا رسول اللہ یہ گوہ ہے۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ گوہ والے کھانے سے اٹھا لیا۔

خالد بن ولید کہتے ہیں، میں نے پوچھا: رسول اللہ، کیا گوہ حرام ہے؟

آپ نے فرمایا: نہیں، مگر میری قوم کے علاقے میں نہیں ہوتی (کھائی نہیں جاتی)۔ اس لیے میں اس سے طبیعت میں ابا محسوس کر کے چھوڑ رہا ہوں۔

خالد کہتے ہیں: میں نے اس کھانے کو اپنی طرف کھینچ لیا اور کھا لیا، جب میں کھا رہا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ رہے تھے، مگر آپ نے مجھے روکا نہیں۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ اس مضمون کی تمام روایات سے تین اصولی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ا۔ آپ نے گوہ کے باب میں اصلاً خاموشی اختیار کی ہے۔ اور فرمایا ہے: میں نہ اسے حرام کرتا ہوں اور نہ خود کھاتا ہوں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ گوہ ایسے جانوروں میں سے ہے جس کا الحاق متعین طور پر انعام کے ساتھ یا درندوں

کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو آپ اسے حرام یا حلال قرار دے دیتے۔

۲۔ آپ نے خود نہیں کھائی اور فرمایا 'أنی أعافه' میں اسے گھن آنے کی بنا پر نہیں کھا رہا ہوں۔ اس سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم احکام شریعت کے تحت لانے میں متردد ہوں، ان میں فیصلہ کن چیز آدمی کی فطرت کی ابا و گریز ہے۔ دوسری علت بو ہے، اس صورت میں نماز کے اوقات کے آس پاس اس کے کھانے میں احتیاط برتنا ہوگی۔

۳۔ آپ نے خود نہیں کھائی، مگر جس نے کھائی اسے کھانے دی۔ اس سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ چونکہ اسے انعام اور غیر انعام کے تحت درجہ بندی میں لانا ممکن نہیں ہے، اس لیے اس کے بارے میں انسان آزاد ہیں، وہ اگر کھا سکتے ہوں تو کھا لیں۔ البتہ آپ کے اپنے عمل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے متردد امور میں گریز ہی بہتر ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت بخاری، رقم ۵۰۷۶ سے لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ روایت کچھ کمی بیشی کے ساتھ درج ذیل کتب میں آئی ہے: بخاری، رقم ۵۰۸۵، ۵۲۱۷، سنن ابی داؤد، رقم ۳۷۳۰، ۳۷۹۴، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۶۳، ۵۲۶۷، سنن الکبریٰ، رقم ۴۸۲۹، ۴۸۲۸، مسند احمد، رقم ۱۹۷۸، ۳۰۶۸، ۱۶۸۵۸، ۱۶۸۵۹، ۱۶۸۶۱، ۲۶۸۵۷، ۸۴۴۴، سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۹۱۹۶، تا ۱۹۱۹۹، ۱۹۲۰۲، ابن ماجہ، رقم ۳۲۴۱، الدارمی، رقم ۲۰۱۷، النسائی، رقم ۴۳۱۶، ۴۳۱۷، مصنف عبد الرزاق، رقم ۸۶۷۱، ۸۶۷۵، ۸۶۷۶، صحیح مسلم، رقم (۳) ۱۹۴۵، (۲) ۱۹۴۶، مسند ابی یعلیٰ، رقم ۷۰۸۴، موطا امام مالک، رقم ۱۷۳۸، ۱۷۳۷، المسند، رقم ۴۸۲۔

یہی روایت ایک دوسرے واقعے کی شکل میں ان مقامات پر وارد ہوئی ہے، اس پر الگ روایت کا گمان ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہی روایت ہے: صحیح مسلم، رقم (۲) ۱۹۴۴، صحیح بخاری، رقم ۶۸۳۹، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۶۴، مسند احمد، رقم ۵۵۶۵، ۶۲۱۳، سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۹۱۹۵۔

یہی روایت ایک شادی کے حوالے سے ان مقامات پر آئی ہے۔ اس پر بھی الگ روایت کا گمان ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہی روایت ہے: مسلم، رقم ۱۹۴۸، مسند احمد، رقم ۳۲۱۹، ۳۰۰۹، ۲۶۸۴، سنن بیہقی، رقم ۱۹۲۰۰۔

یہی روایت مختصر انداز میں درج ذیل مقامات پر آئی ہے، اس پر بھی الگ روایت کا گمان ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہی روایت ہے: صحیح بخاری، رقم ۲۴۳۶، ۵۰۷۴، ۵۰۸۷، ۶۹۲۵، صحیح مسلم، رقم ۱۹۴۷، سنن ابی داؤد، رقم ۳۷۹۳، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۲۱، ۵۲۲۳، مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۳۳۵، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۳۰، ۴۸۳۱، ۶۶۲۷، ۶۷۰۰،

مسند احمد، رقم ۲۲۹۹، ۲۳۵۴، ۲۵۶۹، ۲۹۶۲، ۳۰۴۱، ۳۱۶۳، سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۹۲۰۱، سنن النسائی، رقم ۴۳۱۸، ۴۳۱۹۔

بعض روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خالد بن ولید کے میمونہ کے گھر آنے کا قصہ بیان نہیں ہوا، جیسے صحیح بخاری، رقم ۵۰۸۵، صحیح مسلم، رقم ۱۹۴۵، مسند احمد، رقم ۳۰۶۸، ابن ماجہ، رقم ۳۲۴۱، النسائی، رقم ۴۳۱۶، مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۶۷۵، ۸۶۷۱، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۲۸۔

بعض روایتوں میں خالد بن ولید کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی موجودگی کا بھی ذکر ہے: مسند احمد، رقم ۱۶۸۵۹، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۶۳، ۵۲۶۷، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۲۹۔

صحیح بخاری، رقم ۵۰۸۵، ابن ماجہ، رقم ۳۲۴۱، النسائی، رقم ۴۳۱۶، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۲۸ میں 'ضبا محنوذا' کی جگہ 'بضب مشوی' کے الفاظ آئے ہیں، دونوں کے معنی بھنی ہوئی گوہ کے ہوں گے۔ مسلم، رقم ۱۹۴۵، بخاری، رقم ۵۰۸۵، مسند احمد، رقم ۳۰۶۸، مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۶۷۱ میں 'بضبین مشویین' (دو بھنی ہوئی گوہ) کے الفاظ آئے ہیں۔ موطا امام مالک، رقم ۱۷۳۷ میں 'ضب' کی جمع 'ضباب' استعمال ہوا ہے۔

'وکان قلما یقدم یده لطعام حتی یحدث به ویسمی له' (کم ہی ہوتا تھا کہ آپ کسی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں، اور آپ کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ کھانا کیسا ہے اور کیا پکا ہوا ہے) والا جملہ اکثر روایتوں میں نہیں آیا، مثلاً بخاری، رقم ۵۰۸۵، مسلم، رقم ۱۹۴۵ وغیرہ، البتہ مسلم، رقم ۱۹۴۶ میں یہ جملہ مختلف الفاظ کے ساتھ یوں آیا ہے: 'وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا یأکل شیئا حتی یعلم ما هو' (آپ اس وقت تک کوئی چیز نہ کھاتے جب تک کہ جان نہ لیتے کہ کیا پکا ہوا ہے)۔

صحیح بخاری، رقم ۵۰۸۵، مسند احمد، رقم ۳۰۶۸، مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۶۷۱ میں 'فقالت امراة من النسوة الحضور: اخبرن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ما قدمتن له هو الضب یا رسول اللّٰه. فرفع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یده عن الضب' (تو موجود خواتین میں سے کسی نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاؤ کہ تم نے کیا کھانے کو پیش کیا ہے۔ (لوگوں نے آپ کو بتایا) یارسول اللہ یہ گوہ ہے۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ گوہ والے کھانے سے اٹھا لیا) کے بجائے 'فقیل له انه ضب فامسك یده' (تو آپ کو بتایا گیا کہ یہ گوہ ہے تو آپ نے اپنے ہاتھ روک لیے) کے الفاظ آئے ہیں۔ بخاری، رقم ۵۲۱۷ میں اس کے الفاظ یوں ہیں: 'فقال بعض النسوة أخبروا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بما یرید أن یأکل' کسی عورت

نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تو بتا دو کہ آپ کیا کھانے لگے ہیں۔ سنن ابی داؤد، رقم ۳۷۹۴، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۶۳، میں 'بعض النسوة' (ایک عورت) کے بعد 'اللاتی فی بیت میمونة' (ان عورتوں میں سے جو میمونہ کے گھر میں تھیں) کے الفاظ آئے ہیں۔ صحیح مسلم، رقم ۱۹۴۵، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۶۷ میں 'النسوة' سے پہلے 'بعض' کا لفظ نہیں ہے، یعنی جملہ بس یہ ہے: 'فقالت النسوة اللاتی فی بیت میمونة أخبروا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بما یرید أن یأکل' (میمونہ کے گھر میں موجود عورتوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاؤ کہ وہ کیا کھانا چاہتے ہیں)۔ صحیح مسلم، رقم ۱۹۴۶ میں یہ جملہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ یوں ہے: 'فقالت امراة من النسوة الحضور اخبرن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بما قدمتن له قلن هو الضب یا رسول اللّٰه فرفع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یده' (تو موجود عورتوں میں سے ایک عورت نے کہا کہ تم رسول اللہ کو بتاؤ کہ تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کو کیا پیش کیا ہے، تو ان عورتوں نے بتایا کہ یہ گوہ ہے تو آپ نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے)۔ مسند احمد، رقم ۲۶۸۵۷ میں یہ جملہ یوں ہے: 'ألا تخبرین رسول اللّٰه ما یأکل فأخبرته انه لحم ضب' کیا (اے میمونہ)، تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں بتاؤ گی کہ وہ کیا کھانے والے ہیں؟ تو میں نے آپ کو بتایا کہ یہ گوہ کا گوشت ہے)۔ سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۹۱۹۹ میں یہ جملہ یوں ہے: 'فقالت میمونة أخبروا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ما هو، فلما اخبر ترکه' (میمونہ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاؤ کو یہ کیا ہے۔ جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے اسے کھانا چھوڑ دیا)۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۳۲۴۱، النسائی، رقم ۴۳۱۶، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۲۸ میں یہ جملہ یوں ہے: 'فقال له من حضره یا رسول اللّٰه إنه لحم ضب فرفع یده' (جو لوگ وہاں تھے انھوں نے آپ کو بتایا کہ اے رسول اللہ، یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ نے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا)۔

'فقال خالد بن الولید: احرام الضب یا رسول اللّٰه قال لا ولکن لم یکن بارض قومی فاجدنی اعافه' (خالد بن ولید نے پوچھا: رسول اللہ کیا گوہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، مگر میری قوم کے علاقے میں نہیں ہوتی (کھائی نہیں جاتی)۔ اس لیے میں اس سے طبیعت میں ابا محسوس کر کے چھوڑ رہا ہوں) کے بجائے سنن الکبریٰ، رقم ۴۸۲۹، مسند احمد، رقم ۱۶۸۵۸، میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے: 'لا ولکنه طعام لیس فی أرض قومی ...' (نہیں یہ حرام نہیں لیکن یہ کھانا میری قوم کی سرزمین میں نہیں ہوتا...)۔ اس مکالمے کی جگہ مصنف عبد الرزاق، رقم ۸۶۷۵ میں روایت یوں ہے: 'اتی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بلحم ضب فقال لم یکن ابی - او ابائی - یاکلو نه قال خالد بن الولید لکن ابی قد کان یاکله قال فاکل منه خالد والنبی صلی الله علیه وسلم ینظر الیه'(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گوہ کا گوشت کھانے کو دیا گیا، تو آپ نے فرمایا میرے آباواجداد نے یہ کبھی نہیں کھایا، خالد بن ولید نے کہا، میرے والد کبھی کبھی کھا لیتے تھے، چنانچہ خالد بن ولید نے کھایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے رہے)۔

ان تمام روایتوں میں گوہ کھانے سے انکار کا سبب آپ نے یہ بتایا ہے کہ یہ جانور ہمارے علاقے میں نہیں کھایا جاتا۔ اس لیے میں اس سے طبعی ابا محسوس کرتا ہوں۔ لیکن موطا کی ایک روایت میں فرشتوں کی آمد کو اس کی علت بتایا گیا ہے۔ یہ روایت امام مالک نے اپنی موطا، رقم ۱۷۳۷ میں یوں نقل کی ہے:

عن سلیمان بن یسار انه قال دخل رسول الله صلی الله علیه وسلم بیت میمونة بنت الحارث فاذا ضباب فیها بیض ومعه عبد الله بن عباس وخالد بن الولید فقال من این لکم هذا فقالت اهدته لی اختی هزیلة بنت الحارث فقال لعبد الله بن عباس وخالد بن الولید کلا فقالا او لا تاکل انت یا رسول الله فقال انی تحضرنی من الله حاضرة قالت میمونة انسقیك یا رسول الله من لبن عندنا فقال نعم فلما شرب قال من این لکم هذا فقالت اهدته لی اختی هزیلة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ارایتك جاریتك التی کنت استامرتینی فی عتقها اعطیها اختك وصلی بها رحمك ترعی علیها فانه خیر لك.

''سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میمونہ بنت حارث کے گھر تشریف لے گئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ گوہ کا گوشت پکا ہوا ہے، جس میں انڈے بھی ڈالے گئے ہیں۔ آپ کے ساتھ عبد اللہ بن عباس اور خالد بن ولید بھی تھے۔ آپ نے پوچھا یہ سب تمھارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ تو میمونہ نے کہا، یہ میری بہن ہزیلہ بنت حارث نے تحفہ میں بھیجا ہے۔ آپ نے خالد بن ولید اور ابن عباس سے کہا کھاؤ، تو دونوں نے کہا: کیا آپ نہیں کھائیں گے؟ آپ نے فرمایا: میں وہ شخص ہوں جس کے پاس خدا کی طرف سے آنے والے (یعنی فرشتے) آتے ہیں۔ یہ سن کر میمونہ نے پوچھا: کیا میں آپ کو دودھ پینے کے لیے دوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ جب آپ نے دودھ پی لیا تو آپ نے پوچھا: یہ دودھ کہاں سے آیا تھا؟ انھوں نے کہا: یہ بھی میری بہن ہزیلہ نے بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا: (آپ نے تحائف بھیجنے کے اس عمل سے متاثر ہو کر کہا) کیا خیال ہے، جس لونڈی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کے بارے میں تم آزاد کرنے کا مشورہ مجھ سے کرتی رہی ہو، وہ اپنی بہن کو دے کر صلہ رحمی کرو، وہ اس کی بکریاں چرائے گی۔ اور یہ چیز تمھارے لیے بہتر رہے گی۔''

مراد یہ ہوئی کہ اس کے گوشت سے ناگوار بو آتی ہوگی، جس کی وجہ سے آپ نے اسے کھانے سے گریز کیا، تاکہ اگر خدا کا پیغام لے کر فرشتے آئیں تو انھیں آپ سے کسی قسم کی اذیت نہ پہنچے۔

مسند ابویعلیٰ، رقم ۷۰۸۴ میں خالد بن ولید یا ابن عباس کے بجائے دو نجدی لوگوں کی آمد اور گوہ کھانے کا قصہ نقل ہوا ہے:

عن میمونة قالت اهدی لنا ضب قالت فاتاها رجلان من قومها فامرت به فصنع ثم قرّبته الیهما قالت فجاء نبی النبی صلی اللّٰه علیه و سلم وهما یاکلان فرحب بهما ثم اخذ یاکل فلما اخذ اللقمة الی فیه قال ما هذا قالت ضب اهدی لنا قالت فوضع اللقمة فاراد الرجلان ان یطرحا ما فی افواههما فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم لا تفعلا انکم اهل نجد تاکلونها و انا اهل تهامة نعافها.

''سیدہ میمونہ کہتی ہیں کہ ہمیں ایک گوہ ہدیہ میں بھیجی گئی، اسی اثنا میں ان کی قوم سے دو آدمی ان سے ملنے آئے۔ انھیں گوہ پکانے کو کہا گیا تو انھوں نے گوہ پکائی اور ان کو پیش کی۔ میمونہ کہتی ہیں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، جب آئے تو وہ دونوں گوہ کھا رہے تھے۔ آپ نے دونوں کو آنے پر خوش آمدید کہا۔ اور کھانے میں شریک ہو گئے۔ جب آپ نے لقمہ لیا اور منہ کے پاس لے گئے تو آپ نے پوچھا یہ کیا سالن ہے؟ میمونہ نے کہا یہ گوہ ہے، ہدیے میں آئی تھی۔ آپ نے لقمہ واپس رکھ دیا۔ آپ کو دیکھ کر ان دونوں آدمیوں نے چاہا کہ وہ بھی منہ میں سے کھانے کو نکال پھینکیں (یہ دیکھ کر) آپ نے ان سے کہا: ایسا نہیں کرو، تم اہل نجد گوہ کھا لیتے ہو، ہم تہامہ کے رہنے والے اس سے ابا محسوس کرتے ہیں۔''

بعض روایتوں میں اسی واقعے کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

عن العنبری قال قال لی شعبة أرأیت

''عنبری کہتے ہیں کہ شعبہ نے مجھے حسن بصری کی

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

حدیث الحسن عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، وقاعدت بن عمر قریبا من سنتین أو سنة و نصف فلم أسمعه یحدث عن النبی غیر هذا. قال: کان ناس من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فیهم سعد فذهبوا یاکلون من لحم فنادتهم امراة من بعض ازواج النبی صلی اللّٰه علیه وسلم انه لحم ضب فامسکوا فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کلوا او اطعموا فانه حلال او قال لا باس به شك فیه ولکنه لیس من طعامی.

کثرت روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: دیکھو یہ کتنی حدیثوں کی حکایت کرتے ہیں، جبکہ میں دو یا ڈیڑھ سال تک ابن عمر کے ساتھ بیٹھتا رہا تو انھوں نے بس یہی ایک حدیث سنائی کہ صحابہ میں سے کچھ لوگ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں) تھے جن میں سعد بھی تھے، یہ سب کسی قسم کا گوشت کھاتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں ازواج نبی میں سے کسی نے پکار کر کہا کہ یہ گوہ کا گوشت ہے۔ تو سب نے ہاتھ روک دیے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ، یا (کہا:) تناول کرو کیونکہ یہ حلال ہے۔ یا راوی کو شک ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن یہ میرا کھا جا نہیں ہے۔''

(بخاری، رقم ٦٨٣٩)

یہ الفاظ صحیح بخاری، رقم ٦٨٣٩ کے ہیں، کچھ اختلافات کے ساتھ یہ قصہ ان مقامات پر آیا ہے: صحیح مسلم، رقم (٢) ١٩٤٤، صحیح ابن حبان، رقم ٥٢٦٤، مسند احمد، رقم ٥٥٦٥، ٦٢١٣، سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ١٩١٩٥۔

سنن ابی داؤد کی روایت ٣٧٣٠، مسند احمد، رقم ١٩٧٨، المسند، رقم ٤٨٢، مصنف عبدالرزاق، رقم ٨٦٧٦ میں یہ واقعہ کچھ اور انداز سے سامنے آتا ہے:

عن بن عباس قال: کنت فی بیت میمونة فدخل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ومعه خالد بن الولید فجاؤوا بضبین مشویین علی ثمامتین فتبزق رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال خالد اخالك تقذره یا رسول اللّٰه قال اجل ثم اتی رسول اللّٰه صلی اللّٰه

''ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں میمونہ کے گھر میں تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ان کے ساتھ خالد بن ولید بھی تھے، لوگ بھنی ہوئی دو گوہ دو لکڑیوں پر ڈال کر لائے۔ آپ نے دیکھتے ہی کراہت سے آخ تھو کیا۔ تو خالد بن ولید نے کہا: میرا خیال ہے آپ اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے کہا، ہاں۔ پھر آپ کو دودھ دیا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

علیہ و سلم بلبن فشرب فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم اذا اکل احدکم طعاما فلیقل اللھم بارك لنا فیه واطعمنا خیرا منه واذا سقی لبنا فلیقل اللھم بارك لنا فیه وزدنا منه فانه لیس شیء یجزء من الطعام والشراب الا اللبن. (سنن ابی داؤد، رقم ۳۷۳۰)

گیا تو آپ نے پیا۔ پھر آپ نے فرمایا: جو تم میں سے کھانا کھائے تو یہ دعا کرے: اے اللہ اس کھانے میں ہمیں برکت دے اور ہمیں اس سے بہتر کھانا کھلا، اور جب دودھ پیے تو یہ دعا کرے: اے اللہ اس میں برکت دے اور اس میں اضافہ کر۔ کیونکہ کھانے اور پینے میں سے کفایت کرنے والی غذا صرف دودھ ہے۔‘‘

اس سلسلے کی ایک روایت مسند احمد، رقم ۱۹۷۸ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میمونہ کے گھر میں آمد کے بعد سیدہ میمونہ کا یہ جملہ بھی نقل ہوا ہے: ’فقالت الا نطعمکم من ھدیة اھدتھا لنا ام حفید، قال فجیء بضبین مشویین فتبرق‘ (میمونہ نے کہا: کیا میں آپ کو ایسی چیز نہ کھلاؤں جو ہمیں ام حفید نے تحفے میں بھیجی ہے، تو کہتے ہیں کہ پھر دو بھنی ہوئی گوہ لائی گئیں تو آپ نے کراہت سے آخ تھو کیا)۔ المسند، رقم ۲۸۲ میں یہی جملہ یوں ہے: ’فقالت له میمونة الا نقدم الیك یا رسول اللّٰہ شیئا اھدته لنا ام عفیق فاتته بضباب مشویة‘ (تو آپ سے میمونہ نے کہا: اے رسول اللہ، کیا میں آپ کو ایسی چیز پیش نہ کروں، جو ام عفیق نے ہمیں تحفے میں بھیجی ہے۔ تو پھر وہ پکی ہوئی گوہ لائیں)۔ تھوکنے والا جملہ اس روایت میں یوں آیا ہے: ’فلما رأھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم تفل ثلاث مرات ولم یاکل منھا، وامرنا ان ناکل ثم اتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم باناء فیه لبن فشرب وانا عن یمینه وخالد عن یساره فقال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الشربة لك یا غلام وان شئت اثرت بھا خالدا فقلت ما کنت لاوثر بسؤر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم احدا‘ (جب آپ نے گوہ دیکھی تو آپ نے تین دفعہ تھوکا، اسے نہیں کھایا، البتہ ہمیں آپ نے کھانے کا مشورہ دیا، پھر آپ کو ایک برتن پیش کیا گیا، جس میں دودھ تھا، آپ نے اسے پیا۔ ابن عباس کہتے ہیں میں آپ کے دائیں تھا اور خالد آپ کے بائیں تھے۔ آپ نے ابن عباس سے کہا: اے لڑکے پینے کی باری تو تمھاری ہے۔ اگر تم چاہو تو خالد کو باری سے ہٹ کر پینے دو۔ میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھوٹے دودھ میں میں کسی کو اپنے اوپر ترجیح نہیں دے سکتا۔ پھر ابن عباس کہتے ہیں میں نے دودھ پی کر خالد کی طرف بڑھا دیا، تو انھوں نے بھی پیا)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس روایت کے الفاظ 'و امرنا ان نا کل' کے بجائے مصنف عبدالرزاق، رقم ۸۶۷۶ میں 'و قال لخالد بن الولید و کلوا' (اور آپ نے خالد سے کہا کہ اور بھئی تم لوگ کھاؤ)۔

مسلم، رقم ۱۹۴۸، مسند احمد، رقم ۳۲۱۹، ۳۰۰۹، ۲۶۸۴، سنن بیہقی، رقم ۱۹۲۰۰ میں یہی واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شادی کے حوالے سے بیان ہوا ہے، جب بعض لوگوں نے یہ کہا کہ آپ نے گوہ کے بارے میں فرمایا تھا: نہ میں اسے کھاؤں گا، نہ حرام کروں گا، نہ کسی کو اس کے کھانے کا کہوں گا اور نہ کسی کو اس کے کھانے سے روکوں گا۔ سیدنا ابن عباس اس بات پر غصہ ہوئے اور کہا یہ غلط ہے آپ تو آئے ہی حلت و حرمت کے لیے تھے۔ پھر انھوں نے اصل واقعہ سنایا۔ اس واقعہ میں کچھ تفصیلات مختلف ہیں۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

عن یزید بن الاصم قال: دعانا عروس بالمدینة فقرب الینا ثلاثة عشر ضبابا فاكل و تارك فلقیت بن عباس من الغد فاخبرته فاكثر القوم حوله حتى قال بعضهم قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه علیه وسلم لا اكله ولا انهى عنه ولا احرمه فقال بن عباس بئس ما قلتم ما بعث نبى اللّٰه صلى اللّٰه علیه وسلم الا محلا ومحرما ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه علیه وسلم بینما هو عند میمونة وعنده الفضل بن عباس وخالد بن الولید وامراة اخرى اذ قرب الیهم خوان علیه لحم فلما اراد النبى صلى اللّٰه علیه وسلم ان یاكل قالت له میمونة انه لحم ضب فكف یده وقال هذا لحم لم اكله قط وقال لهم كلوا فاكل منه الفضل وخالد بن الولید والمراة

''یزید بن اصم کہتے ہیں: مدینہ میں ایک دلہا نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ اس نے ہمارے آگے تیرہ گوہ رکھے۔ (لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے)۔ ایک کھانے والے اور دوسرے نہ کھانے والے۔ اگلی صبح میں ابن عباس سے ملا، تو ان کے گرد بہت سے لوگ ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے یہ تک کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا: نہ میں اسے کھاؤں گا، نہ اس سے کسی کو روکوں گا اور نہ اسے حرام قرار دوں گا۔ ابن عباس نے یہ سنا تو فرمایا: کیا بری بات ہے جو تم لوگوں نے کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حلال و حرام ہی تو بتانے آئے تھے (بھلا وہ ایسی بات کیوں کر کہتے) جب آپ میمونہ کے ہاں تھے تو آپ کے ساتھ فضل بن عباس، اور خالد بن ولید اور ایک عورت بھی تھی۔ جب آپ کے سامنے دستر خوان آیا، تو اس پر دیکھا کہ گوشت بھی تھا آپ نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میمونہ نے بتایا کہ یہ گوہ کا گوشت ہے۔ آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ پھر فرمایا کہ یہ گوشت میں نے کبھی نہیں کھایا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وقالت ميمونة لا اكل من شيء الا شيء ياكل منه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم.

لیکن موجود لوگوں سے کہا کھاؤ۔ فضل بن عباس، خالد بن ولید اور اس عورت نے کھایا، مگر میمونہ نے یہ کہا کہ میں بس وہ چیز کھاؤں گی، جسے آپ کھائیں گے۔''

مختصر انداز میں یہ روایت اس طرح بھی آئی ہے۔ سیدہ میمونہ والے واقعے ہی کو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بالاختصار یوں بیان کیا ہے:

قال بن عباس رضي اللّٰه عنهما: اهدت ام حفيد خالة بن عباس الى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم اقطا وسمنا واضبا فاكل النبي صلى اللّٰه عليه وسلم من الاقط والسمن وترك الضب تقذرا . قال بن عباس فاكل على مائدة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ولو كان حراما ما اكل على مائدة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم.

''ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ام حفید، ابن عباس کی خالہ، نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پنیر، گھی اور گوہ تحفے میں بھیجیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پنیر اور گھی کھا لیا اور گوہ کراہت کی بنا پر نہیں کھائی۔ ابن عباس کہتے ہیں: پھر آپ کے دستر خوان پر گوہ کو کھایا گیا (یعنی آپ کے سامنے) اگر گوہ حرام ہوتی تو آپ کے دستر خوان پر نہ کھائی جاتی۔''

یہ الفاظ بخاری، رقم ۲۴۳۶ کے ہیں اس کے علاوہ یہ روایت ان مقامات میں آئی ہے: بخاری، رقم ۵۰۷۴، ۵۰۸۷، ۶۹۲۵، صحیح مسلم، رقم ۱۹۴۷، سنن ابی داؤد، رقم ۳۷۹۳، صحیح ابن حبان، رقم ۵۲۲۱، ۵۲۲۳، مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۳۳۵، السنن الکبریٰ، رقم ۴۸۳۰، ۴۸۳۱، السنن الکبریٰ، رقم ۶۶۲۷، ۶۷۰۰، مسند احمد، رقم ۲۲۹۹، ۲۳۵۴، ۲۵۶۹، ۲۹۶۲، ۳۰۴۱، ۳۱۶۳، سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۹۲۰۱، سنن النسائی، رقم ۴۳۱۸، ۴۳۱۹۔

بخاری، رقم ۵۰۷۴ میں آخری جملہ یوں ہے: 'فدعا بهن فأكلن على مائدته، و تركهن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم كالمستقذر لهن، ولو كن حراما، ما أكلن على مائدة النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ولا أمر بأكلهن' (آپ نے ان سے پکے کھانے پر ہمیں بلایا، پھر یہ آپ کے دستر خوان پر کھائی گئیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ناپسند کرنے والے کی طرح چھوڑا (نہ کہ حرام قرار دے کر)، کیونکہ اگر حرام ہوتیں، تو آپ کے دستر خوان پر نہ کھائی جاتیں اور نہ آپ ہمیں ان کے کھانے کو کہتے۔ سنن الکبریٰ، رقم ۶۶۲۷ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کراہت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: 'فقال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم أما

هـذه فـليـس تكون بأرضنا فمن أحب منكم أن يأكل على خواء و لم يأكل منهٔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ہمارے وطن (تہامہ) میں نہیں (کھائی جاتی)۔ تو جو تم میں سے بھوک کی صورت میں کھانا چاہے وہ اسے کھائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہیں کھایا۔

مسند احمد، رقم ۸۴۴۴ میں یہ قصہ یوں بیان ہوا ہے: 'أتی النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم بسبعة أضب علیها تمر و سمن فقال کلوا فإنی أعافها' (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سات گوہ پیش کی گئیں، جن پر کھجوریں اور گھی بھی ڈالا گیا تھا۔ آپ نے لوگوں سے کہا: کھاؤ، مجھے کراہت محسوس ہوتی ہے (میں نہیں کھاؤں گا)۔

مسند احمد، رقم ۱۹۴ میں سیدہ میمونہ اور سیدہ عائشہ کے گھر گوہ کھانے سے گریز کے ایسے واقعات کے پیش نظر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خیال آپ کے اس عمل کے بارے یوں بیان ہوا ہے: 'ان عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه قال ان نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم لم یحرم الضب و لکن قذره' (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ ناپسند کی حرام نہیں کی)۔

یہ جملہ سنن دارمی، رقم ۲۰۱۷ سے لیا گیا ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سنن یہ ہیں:

۱۔ ابتلا

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ خدا کے ایک عالم گیر قانون کی حیثیت سے یہ امتحان تمام عالم انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان کی طبیعت میں جو کچھ ودیعت ہے، وہ اسی امتحان سے نمایاں ہوتا، نفس کے اسرار اسی سے کھلتے اور علم و عمل کے درجات اسی سے متعین ہوتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ موت و حیات کا یہ کارخانہ وجود میں آیا ہی اس لیے ہے کہ اس کا پروردگار دیکھ لے کہ کون سرکشی اختیار کرتا اور کون اس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، لیکن اس نے یہ سنت ٹھیرائی ہے کہ لوگوں کے ساتھ جزا و سزا کا معاملہ وہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہ کرے گا، بلکہ لوگوں کے عمل کی بنیاد پر کرے گا۔ یہ امتحان اسی مقصد سے برپا کیا گیا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً، وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ. (الملک ۶۷:۲)

''(وہی) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔''

اس دنیا میں رنج و راحت، غربت و امارت، دکھ اور سکھ کی جو حالتیں انسان کو پیش آتی ہیں، وہ اسی قانون کے تحت

ہیں۔ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا اور ان کے کھوٹے اور کھرے میں امتیاز فرماتا ہے۔ وہ کسی کو مال و دولت اور عز و جاہ سے نوازتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور کسی کو فقر و مسکنت میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے صبر کا امتحان کرتا ہے:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً، وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۳۵)

''اور ہم تمھیں دکھ سکھ سے آزما رہے ہیں، پرکھنے کے لیے اور تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ لکھا ہے:

''...وہ جن کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اس کے شکر گزار، متواضع اور فرماں بردار بندے بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو دھتکارنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر، حاصل نعمتوں اور اپنی نان جویں پر قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر میں خوددار رہتے ہیں یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۶۰)

زمین کا یہ ساز و سامان بھی جس پر انسان فریفتہ ہے، اسی امتحان کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ یہ سامان عیش نہیں، بلکہ وسیلۂ امتحان ہے جس کے درمیان انسان کو رکھ کر اللہ تعالیٰ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرتا اور اس طرح آخرت کی فوز و فلاح سے ہم کنار ہوتا ہے یا اس کی دل فریبیوں میں گم ہو کر اپنی راہ کھوٹی کر لیتا ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا، لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (الکہف ۱۸: ۷)

''زمین پر جو کچھ بھی ہے، اسے ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ انھیں آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کون اپنی عقل و تمیز سے کام لے کر آخرت کا طالب بنتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اسی دنیا کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ اس امتحان کے تقاضے سے ہم نے اس دنیا کے چہرے پر حسن و زیبائی کا ایک پرفریب غازہ مل دیا ہے۔ اس کے مال و اولاد، اس کے کھیتوں کھلیانوں، اس کے باغوں اور چمنوں، اس کی کاروں اور کوٹھیوں، اس کے محلوں اور ایوانوں، اس کی صدارتوں اور وزارتوں میں

بڑی کشش اور دل فریبی ہے۔ اس کی لذتیں نقد اور عاجل اور اس کی تلخیاں پس پردہ ہیں۔ اس کے مقابل میں آخرت کی تمام کامرانیاں نسیہ ہیں اور اس کے طالبوں کو اس کی خاطر بے شمار جان کاہ مصیبتیں نقد نقد اسی دنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ امتحان ایک سخت امتحان ہے۔ اس میں پورا اترنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اس میں پورے وہی اتریں گے جن کی بصیرت اتنی گہری ہو کہ خواہ یہ دنیا ان کے سامنے کتنی ہی عشوہ گری کرے، لیکن وہ اس عجوزۂ ہزار داماد کو اس کے ہر بھیس میں تاڑ جائیں اور کبھی اس کے عشق میں پھنس کر آخرت کے ابدی انعام کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوں۔'' (تدبر قرآن ۴/۵۵۸)

یہ ابتلا کا عام قانون ہے۔ اس کا ایک خاص پہلو قرآن مجید میں یہ بیان ہوا ہے کہ رسولوں کی بعثت کے نتیجے میں جو دینونت اللہ تعالیٰ کی طرف سے برپا کی جاتی ہے، اس میں ایمان واسلام کا دعویٰ کرنے والوں کو بعض ایسی آزمایشوں سے گزرنا پڑتا ہے جو عام لوگوں کو بالعموم پیش نہیں آتیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا، وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا، وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ. (العنکبوت ۲۹: ۲-۳)

''کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہہ دینے سے چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم (پیغمبر پر) ایمان لائے، اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے، دراں حالیکہ جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، ہم نے اُنھیں بھی (اسی طرح) آزمایا ہے۔ سو اللہ اُنھیں الگ کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی الگ کر کے رہے گا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللہ کے رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ آزمایشیں عذاب سے پہلے تطہیر کے لیے پیش آتی ہیں۔ ان آیتوں میں یہی حقیقت ہے جسے 'فلیعلمن اللّٰه الذين صدقوا، وليعلمن الكذبين' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ آخری فیصلے سے پہلے یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہو جائے کہ کون کہاں کھڑا ہے؟ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر بھی یہ سنت الٰہی اسی تاکید کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ، قَالُوْٓا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۵۵-۱۵۶)

''ہم تمھیں لازماً کچھ خوف، کچھ بھوک اور کچھ جان و مال اور کچھ پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ اور (اِس میں) جو لوگ ثابت قدم ہوں گے، (اے پیغمبر)، انھیں (دنیا اور آخرت، دونوں میں کامیابی کی) بشارت دو۔ (وہی) جنھیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہیں کہ لاریب،

ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں (ایک دن) اسی کی طرف
پلٹ کر جانا ہے۔‘‘

۲۔ ہدایت وضلالت

اس ابتلا میں انسان سے تقاضا کیا گیا ہے کہ گمراہی سے بچے اور اپنے لیے ہدایت کا راستہ اختیار کرے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ ہدایت اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ پھر شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد زمین و آسمان کی نشانیاں اس کی طرف اسے متوجہ کرتی ہیں۔ انسان اگر اس ہدایت کی قدر کرے، اس سے فائدہ اٹھائے اور خدا کی اس نعمت پر اس کا شکر گزار ہو تو خدا کی سنت ہے کہ وہ اس کی روشنی کو اس کے لیے بڑھاتا، اس کے اندر مزید ہدایت کی طلب پیدا کرتا اور اس کے نتیجے میں انبیا علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت سے اس کو بہرہ یاب ہونے کی توفیق عطا فرماتا ہے:

نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ، یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ، وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. (النور ۲۴:۳۵)

’’روشنی پر روشنی، اللہ جس کی چاہتا ہے، اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔‘‘

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی، وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ. (محمد ۴۷:۱۷)

’’اور جنھوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ نے انھیں اور ہدایت دی اور اُن کے حصے کا تقویٰ بھی انھیں عطا فرمایا ہے۔‘‘

یہ اتمام ہدایت ہے اور قرآن مجید نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ خدا کی مشیت کے بغیر اس کی طلب بھی کسی شخص کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ مشیت اسی قانون سے وابستہ ہے۔ خدا علیم و حکیم ہے۔ وہ یہ نعمت انھی کو دیتا ہے جو اپنی فطرت میں ودیعت اس کی ہدایت کو قبول کرتے ہیں:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ، فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا، وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا، یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ، وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا. (الدهر ۷۶:۲۹-۳۱)

’’یہ (قرآن) تو ایک یاددہانی ہے، اس لیے جس کا جی چاہے، اپنے رب کی راہ اختیار کرے۔ اور تم نہیں چاہتے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے (اِسی علم و حکمت کی بنا پر) اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور یہ ظالم، ان کے لیے تو اس نے ایک بڑا دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

انسان اس فطری ہدایت سے اعراض کا فیصلہ کر لے، اپنی عقل سے کام نہ لے اور جانتے بوجھتے حق سے انحراف

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کرے تو قرآن کی اصطلاح میں یہ ظلم اور فسق ہے اور خدا کسی ظالم اور فاسق کو کبھی ہدایت نہیں دیتا، بلکہ اسے گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ. (یونس ۱۰:۱۰۰)

''اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر (پیغمبر پر) ایمان لائے۔ (یہ اجازت انھی کو ملتی ہے جو اپنی عقل سے کام لیں) اور جو عقل سے کام نہیں لیتے، اُن پر وہ (گمراہی کی) نجاست ڈال دیتا ہے۔''

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس طرح کے مجرموں کی ضد، نفسانیت اور ہٹ دھرمی میں اس سے اضافہ ہو جاتا اور وہ صحیح طریقے پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس جرم کی پاداش میں بالآخر اللہ ان کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ، لَا يُؤْمِنُوْنَ، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ، وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ، وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (البقرہ ۲:۶-۷)

''جن لوگوں نے (اس کتاب کو) نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے، اُن کے لیے برابر ہے، تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ نہ مانیں گے۔ اُن کے دلوں اور کانوں پر (اب) اللہ نے (اپنے قانون کے مطابق) مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور قیامت کے دن ایک بڑا عذاب ہے جو اُن کے لیے منتظر ہے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا، قُلْ: اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ، وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ، لَا يُؤْمِنُوْنَ، وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ، كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ، وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ. (الانعام ۶:۱۰۹-۱۱۰)

''اور یہ لوگ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی آئی تو وہ اِس پر ضرور ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور تم کس طرح سمجھو گے کہ نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان نہ لائیں گے اور (اِن کے اس جرم کی پاداش میں) ہم ان کے دلوں اور نگاہوں کو الٹ دیں گے، جس طرح وہ پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ان کو ہم اِن کی سرکشی

میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

''... یہ اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے تحت کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے اور کوئی اس سے محروم رہتا ہے... اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جوان گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں، جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور وفکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں، ان کو حرز جاں بناتے ہیں، ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اور اپنی خود پرستیوں میں مگن رہتے ہیں، قرآن اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیا کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر ونظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں، ان کے دل اور ان کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویے ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی سنت اللہ کی طرف ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾[45] میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنت اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے۔ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق وانفس میں موجود ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات ودلائل واضح کیے، جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے، وہ کل کس طرح دور ہو جائے گا اور جو اندھا پن آج دیکھنے سے مانع ہے، وہ اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں، اسی طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو، وہ قلب ماہیت اس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۴۰)

[باقی]

---

۴۵ الصّف ۶۱: ۵۔

پروفیسر خورشید عالم

چہرے کا پردہ اور ''حکمت قرآن''

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

—— ۵ ——

حکمت قرآن مئی ۲۰۰۶ کے شمارے میں حافظ محمد زبیر صاحب کے مضمون کی چھٹی قسط شائع ہوئی۔اس قسط کا جواب پیش خدمت ہے۔انھوں نے چہرے کے پردے کے عدم وجوب میں پیش کی جانے والی چوتھی، پانچویں اور چھٹی دلیل کی تردید کی ہے، گویا کہ اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی صرف چھ دلیلیں ہیں حالاں کہ علامہ البانی نے ۱۳ صحیح احادیث اور ۱۶ آثار پیش کیے ہیں۔مگر صرف چھ دلائل کا جواب دے کر حافظ صاحب کے ترکش کے سب تیر ختم ہو گئے۔

چوتھی دلیل سنن ابی داؤد کی وہ روایت ہے جو ''کتاب اللباس'' میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ''اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔انھوں نے باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے۔آپ نے منہ موڑ لیا اور فرمایا کہ جب عورت حیض کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے لیے مناسب نہیں کہ اس کے سوا اس کے بدن کا کوئی اور حصہ نظر آئے اور آپ نے چہرے اور دونوں ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔'' صاحب مضمون نے غلط طور پر 'لم تصلح' کا صیغہ لکھا ہے، جبکہ روایت میں 'لم یصلح' ہے۔غالباً انھوں نے ایسا اس لیے کیا ہے تا کہ اس کا فاعل 'المراۃ' کو قرار

دیا جائے۔ یہ تحریف ہے۔ صاحب مضمون کی یہ بات بھی غلط ہے کہ علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں علامہ البانی کا موقف اور تحقیق پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے راوی خالد بن دریک اور سعید بن جبیر پر صاحب مضمون کی جرح کا جواب دیں۔

حنفی فقہ کی کتاب ''منیة المصلی'' کی شرح ''المجلی لما فی منیة المصلی'' (ص۱۷۵) کا اقتباس اس سلسلہ میں قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

> ''ہمارے (احناف) اور جمہور علما کے نزدیک مرسل روایت قابل قبول ہے۔ خالد بن دریک کا تعلق اگرچہ طبقۂ ثالثہ (تیسرے طبقہ) سے ہے، لیکن حضرت عائشہ اور ام سلمہ سے اس کا سماع کچھ بعید نہیں۔ اس کا کافی امکان ہے جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس پر تحقیق کی ہے۔ ابن معین اور نسائی نے خالد کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ائمہ میں سے ایوب سختیانی، ابن عون اور اوزاعی نے اس سے روایت کی ہے۔ ابن حجر کا قول ہے کہ وہ ثقہ ہے اور حضرت عائشہ اور ابن عمر سے مرسل روایت کرتا ہے... خالد ثقہ راوی ہے اور جیسا کہ محقق امیر حاج نے ''الحلیة'' میں کہا ہے کہ ثقہ کی مرسل روایت مقبول ہوتی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سعید بن بشیر کے متعلق شعبہ کا قول ہے کہ 'صدوق اللسان' (زبان کا بہت سچا) ہے۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ 'محلہ الصدق'۔ ابن الجوزی کا قول ہے کہ شعبہ اور دحیم نے اسے ثقہ گردانا ہے۔ ابن عدی کا قول ہے کہ ''اس کی روایت میں کوئی ہرج نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ وہم اور غلطی کا شکار ہو۔ اہل دمشق کے پاس اس کی بہت سی تصانیف تھیں۔ میں نے بھی اس کی تصنیف دیکھی ہے۔ اس پر صدق غالب ہے۔'' ہمارے نزدیک تعدیل جرح پر مقدم ہے خاص طور پر اگر وہ شعبہ اور دحیم جیسے سخت گیروں کی طرف سے ہو۔ بخاری نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں سوء حفظ کے سوا اور کوئی نقص نہیں، مگر فسوی نے ابومسہر سے روایت کی ہے کہ ہمارے شہر میں حافظے کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ ابن عیینہ کا قول ہے کہ وہ حافظ ہے۔ زیادہ درستی کی موجودگی میں معمولی سی غلطی معاف ہوتی ہے، جیسا کہ ابن حبان کا قول ہے کہ بڑے ثقہ ائمہ بھی وہم اور غلطی سے مبرا نہیں ہوتے پھر اتقان (پختگی) میں تھوڑی سی کوتاہی راوی کو صحت سے حسن کے درجہ تک تو نازل کرسکتی ہے، مگر ضعف کے درجہ تک بالکل نہیں۔

علامہ البانی ''جلباب المراۃ'' کے صفحہ (۵۷۔۵۸) میں لکھتے ہیں کہ اگر اس روایت میں ارسال کی علت نہ ہوتی جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے تو یہ اس بات کی واضح دلیل تھی کہ عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے جائز ہیں، مگر جو بات اسے تقویت بخشتی ہے وہ اس کا درج ذیل طریقوں سے مروی ہونا ہے۔

۱۔اسے ابوداؤد نے مراسیل (نمبر۴۳۷) میں صحیح سند کے ساتھ قتادہ سے روایت کیا ہے۔ یہ صحیح مرسل ہے جسے دوسری روایات سے تقویت ملتی ہے۔اس میں نہ ابن دریک ہے نہ ابن بشیر۔

۲۔اسے طبرانی نے ''الکبیر'' (۲۴: ۱۴۳) اور ''الاوسط'' (۲: ۲۳۰) میں روایت کیا ہے۔ ھیثمی نے طبرانی کی روایت بیان کرنے کے بعد ''مجمع الزوائد'' (۵: ۱۳۷) میں لکھا ہے اس میں راوی ابن لہیعہ ہے جس کی حدیث حسن ہے۔اوراس کے باقی راوی صحت کے مقام پر ہیں۔

۳۔امام بیہقی نے اسے ایک اور طریقے سے روایت کیا ہے۔وہ 'الا ما ظھر منھا' کے متعلق ابن عباس کے قول کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں۔اس مرسل روایت کے ساتھ صحابہ کے اس قول کو شامل کر لیجیے جو اس بارے میں ہے کہ اللہ نے زینت ظاہرہ میں سے کیا مباح کیا ہے تو یہ روایت قوی ہو جاتی ہے۔

امام ذھبی نے ''تہذیب سنن البیہقی'' (۱: ۳۸) میں امام بیہقی کے قول کی تائید کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''جن صحابہ کی طرف بیہقی نے اشارہ کیا ہے ان سے مراد حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس ہیں۔علما کا قول ہے کہ زینت ظاہرہ سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں۔ یہ ابن عمر کے الفاظ ہیں پھر وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے اس مفہوم کو عطاء بن ابی رباح اور سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے اور امام اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔''

۴۔ابن ابی شیبہ نے ''المصنف'' (۴: ۲۸۳) میں روایت بیان کی ہے کہ زیاد بن ربیع نے ہم سے حدیث بیان کی اس نے صالح الدھان سے سنی اس نے جابر بن زید سے اس نے ابن عباس سے انھوں نے کہا: '''الا ما ظھر منھا' سے مراد ہاتھ اور چہرے کی ٹکڑی ہے۔'' جیسا کہ اس روایت کو اسماعیل قاضی نے صحیح سند سے پیش کیا ہے۔ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' (۱: ۲۸۴) میں لکھا ہے کہ اسماعیل قاضی نے ابن عباس کی روایت کو مرفوعاً جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ پھر ابن ابی شیبہ نے مذکورہ اثر کے ساتھ ابن عمر کا اثر بیان کیا ہے جس کی سند بھی صحیح ہے۔جمہور صحابہ بھی اسی حدیث پر عمل پیرا رہے ہیں۔امام شافعی کا قول ہے کہ اگر جمہور علما مرسل حدیث پر عمل کریں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔علامہ موفق الدین ابن قدامہ ''المغنی'' (۷: ۴۶۲) میں لکھتے ہیں کہ ''امام احمد نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے دو اقوال میں سے صحیح تر یہی ہے کہ چہرے کا پردہ واجب نہیں۔'' ابی داؤد کی شرح ''عون المعبود'' (۱۱: ۱۶۴) میں ہے کہ ''یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں پس اجنبی کے لیے جائز ہے کہ وہ اجنبی عورت کے چہرے پر نظر ڈالے بشرطیکہ فتنہ کا ڈر نہ ہو۔ (یعنی فتنہ نظر کا فتنہ ہے) منذری، زیلعی، عسقلانی، بیہقی اور شوکانی کے پائے کے محدثین نے اس روایت کی تقویت کی ہے۔'' میرا خیال ہے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

کہ یہ تصریحات صاحب مضمون کے خیال کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

جہاں تک صاحب مضمون کی بیان کردہ چوتھی علت کا تعلق ہے۔امام بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ 'سدل' کے بارے میں حضرت عائشہ کا احرام والی عورت کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے:'تسدل الثوب علی وجهها ان شاءت' یعنی ''اگر عورت چاہے تو کپڑا اپنے چہرے پر لٹکا سکتی ہے۔''اس پر علامہ البانی فرماتے ہیں کہ ''میں کہتا ہوں کہ احرام والی عورت کو حضرت عائشہ کا 'سدل' کے بارے میں اختیار دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کے نزدیک چہرہ قابل پوشیدگی نہیں ہے، وگرنہ وہ 'سدل' کو احرام والی عورت پر واجب قرار دیتیں۔''

جس حدیث کو صاحب مضمون نے انتہائی ضعیف کہا ہے اسے اکثر مفسرین نے ابن عباس کے قول کی تائید میں پیش کیا ہے۔ان میں ابن کثیر جیسے محدث بھی شامل ہیں۔قارئین کی تسلی کے لیے میں اللہ تعالیٰ کے قول 'الا ما ظهر منها' (۲۴:۳۰) کی تفسیر کے اقتباسات قدیم وجدید مفسرین کی کتابوں سے پیش کروں گا جس سے زیر نظر حدیث اور ابن عباس کے قول کی ثقاہت واضح طور پر معلوم ہو جائے گی۔

امام طبری تفسیر بالروایہ کے امام گردانے جاتے ہیں۔وہ جامع البیان مطبوعہ دارالفکر (۱۰:۱۱۹) میں حضرت عائشہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ ''میرے ماں جائے بھائی عبد اللہ بن طفیل کی بیٹی بن ٹھن کر میرے پاس آئی۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آئے تو آپ نے (دیکھ کر) منہ موڑ لیا۔حضرت عائشہ نے کہا: اے اللہ کے رسول، وہ میری بھتیجی ہے اور (ابھی) لڑکی ہے۔آپ نے فرمایا کہ جب عورت کو حیض آجائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ چہرے کے سوا اور اس سے نیچے کے سوا (آپ نے اپنا بازو پکڑا اور اپنی مٹھی اور ہتھیلی کے درمیان مٹھی بھر جگہ چھوڑ دی) کوئی عضو کھلا رہے۔''ابو علی رازی نے اسے اشارۃً بتایا۔اس کا طریق اگرچہ سنن ابی داؤد کی روایت سے مختلف ہے، مگر مضمون وہی ہے۔امام طبری مختلف روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں صحیح ترین قول اس قائل کا ہے جو 'الا ما ظهر منها' سے چہرہ اور ہتھیلیاں مراد لیتا ہے۔...ہم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ ہر نمازی نماز کے دوران میں اپنا ستر واجبی طور پر ڈھانپے رکھے۔اور عورت کو اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی رکھنی چاہییں اور باقی سارا بدن ڈھانپے رکھے۔...جب اس بات پر اجماع ہے تو معلوم ہوا کہ عورت اپنے بدن کے اس حصہ کو کھلا رکھ سکتی ہے جو ستر میں شامل نہیں، جیسا کہ مردوں کے بارے میں بھی یہی حکم ہے، کیونکہ جو ستر نہیں اسے کھلا رکھنا حرام نہیں۔جب وہ اس کا اظہار کر سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے قول 'الا ما ظهر منها' میں اسی کو مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ یہی وہ سب کچھ ہے جو اس کا ظاہر رہتا ہے۔(یعنی چہرہ اور ہتھیلیاں) تفسیر ابن ابی حاتم رازی مطبوعہ

نزار مصطفیٰ مکتۃ المکرّمہ (۸:۲۵۷۴۔۲۵۷۵) میں 'الا ما ظھر منھا' کے سلسلہ میں تین اقوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا قول یہ ہے کہ ہمیں حدیث سنائی الاشج نے اسے سنائی ابن نمیر نے اس نے روایت کی اعمش سے اس نے سعید بن جبیر سے اور انھوں نے عباس سے کہ اس سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ اور انگوٹھی ہیں۔ ابن عمر، عطاء بن ابی رباح، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، ضحاک، عکرمہ، ابی صالح اور زیاد بن ابی مریم نے اسی قسم کی روایت کی ہے۔

دوسرا قول ابن مسعود کا ہے کہ اس سے مراد ظاہری کپڑے ہیں۔ حسن ابن سیرین نے یہ روایت کی ہے۔ ابی صالح، ماھان، ابی الجوزاء اور ابراہیم کی ایک روایت یہی ہے۔ تیسری روایت، ہمیں ابوزرعہ نے حدیث سنائی اسے یحییٰ بن عبداللہ نے اسے ابن لہیعہ نے اس نے عطاء سے روایت کی اس نے ابن جبیر سے کہ اللہ کے قول 'الا ما ظھر منھا' سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں۔ چہرے کی زینت سرمہ اور ہاتھوں کی زینت مہندی ہے، اجنبی کے لیے ان دونوں کے علاوہ کسی اور عضو کا دیکھنا جائز نہیں۔

امام رازی ''تفسیر کبیر'' (مطبوعہ ایران) (۲۳:۲۰۵) میں لکھتے ہیں: ''قفال کا قول ہے کہ آیت کے معنی ہیں کہ سوائے اس کے جس کا اظہار انسان عادت جاریہ میں کرتا ہے۔ عورتوں میں یہ چیز چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں اور مردوں میں چہرہ اور اس کا گرد و نواح، دونوں ہاتھ اور پاؤں۔ پس حکم ہوا اسے چھپاؤ جسے کھلا رکھنے کی ضرورت نہیں اور اسے کھلا رکھنے کی اجازت دی گئی جو عادتاً کھلا رہتا ہے، کیونکہ شریعت اسلام ایک آسان اور روادار شریعت ہے۔ چہرے اور ہاتھوں کو ظاہر کرنا چونکہ ضروری ہے، اس لیے علما نے بدیہی طور پر اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ وہ ستر میں شامل نہیں۔''

زمخشری کا ذہن چہرے کے پردے کے بارے میں بالکل صاف ہے۔ وہ ابن عباس اور ابن مسعود کے اقوال نقل کیے بغیر ''الکشاف'' مطبوعہ دارالمعرفہ (۳:۶۱) میں کہتے ہیں: ''اگر آپ پوچھیں کہ زینت ظاہرہ کے اظہار کی مطلقاً اجازت کیوں دی گئی ہے تو میرا جواب ہے کہ اس کے چھپانے میں تنگی ہے۔ عورت کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چیزیں لے اور دے اور اپنا چہرہ کھلا رکھے خاص طور پر شہادت، مقدمات اور نکاح کے موقع پر۔ اسے راستوں پر چلنا پڑتا ہے اور اس کے پاؤں دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر تنگ دست اور محتاج عورتوں کے (جن کے پاس موزے اور کبھی کبھی جوتا بھی نہیں ہوتا) اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے قول 'الا ما ظھر منھا' کا یعنی سوائے اس کے جو عادتاً اور فطرتاً ظاہر ہو جائے اور اس میں ظہور ہی اصل چیز ہے۔'' دیکھا پانچویں چھٹی ہجری کے بالغ نظر مفسر نے عورت کی مشکلات کا اندازہ کر لیا جبکہ بیسویں صدی عیسوی کے محقق کی نظروں سے یہ

مشکلات اوجھل ہیں۔

امام ابوالبرکات نسفی کا ذہن بھی زمخشری کی طرح بالکل صاف ہے۔ وہ مختلف اقوال کا ذکر کیے بغیر اپنی قطعی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی تفسیر ''مدارك التنزيل'' میں لکھتے ہیں: ''الا ما ظهر' سے مراد وہ زینت ہے جو بطور عادت اور جبلت ظاہر ہو اور اس سے مراد چہرہ، ہاتھ اور پاؤں ہیں جن کے چھپانے میں عورت کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے چیز لیتے دیتے وقت لازمی طور پر ہاتھوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اور شہادت، مقدمات اور نکاح کے موقع پر چہرہ کھلا رکھنا پڑتا ہے اور نادار عورتوں کو راستوں پر چلتے سمے پاؤں کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔''

تفسیر خازن مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت (۳: ۳۲۶) میں لکھا ہے کہ ''اگر فتنے اور شہوت کا ڈر ہو تو اجنبی نگاہیں نیچی کر لے۔ عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھوں کو ظاہر کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ وہ ستر میں شامل نہیں اور نماز میں بھی انھیں کھلا رکھنے کا حکم ہے۔ باقی ماندہ بدن ستر ہے۔'' اس میں اہم بات یہ ہے کہ فتنہ کی صورت میں مرد کو نگاہیں نیچی کرنے کا حکم ہے نہ کہ عورت کو چہرہ چھپانے کا۔

امام قرطبی اپنی تفسیر جامع احکام القرآن (۱۲: ۲۲۹) میں پہلے ابن عطیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ استثنا میں وہ زینت شامل ہے جسے غالباً ضرورت حرکت کی وجہ سے ظاہر کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو اور اس کا سبب اصلاح احوال ہو۔ اس بنا پر ہر وہ زینت جسے ضرورت کے تحت ظاہر کرنا پڑے اس میں عورت کو چھوٹ دی گئی ہے۔ امام قرطبی اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ یہ قول خوب ہے، مگر عام طور پر چہرے اور ہاتھوں کو عادتاً اور عبادتاً (جیسا نماز اور حج میں) کھولنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کا استثنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے بیان کی ہے۔ روایت کا متن بیان کرنے کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں کہ احتیاط اور لوگوں کے اخلاقی بگاڑ کے پیش نظر یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ امام قرطبی کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر بحث روایت قابل حجت ہے۔ اور اللہ نے فتنہ کو سامنے رکھ کر چہرے اور ہاتھوں کا استثنا رکھا ہے۔

حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر (۳: ۲۸۳) میں ایک طرف ابن مسعود، حسن اور ابن سیرین کے اقوال اور دوسری طرف ابن عباس، ابن عمر، عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابوالشعثاء، ضحاک اور ابراہیم نخعی کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''دوسرا احتمال یہ ہے کہ ابن عباس اور ان کے ہمنوا 'الا ما ظهر منها' کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کرتے ہیں اور جمہور علما کے یہاں یہی قول مشہور ہے اور اس کے لیے اس حدیث کی طرف توجہ دی جا سکتی ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔'' انھوں نے اس حدیث کو مرسل ضرور کہا ہے، مگر صاحب مضمون کی طرح نہایت ضعیف نہیں کہا۔

ان کے الفاظ ہیں کہ اس حدیث سے استیناس کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ وہ اسے قابل حجت سمجھتے ہیں۔ صاحب مضمون کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ثقہ کی مرسل امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک قابل حجت ہے۔ امام شافعی کے قول کا بھی اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے کہ اگر اکثر علما کا عمل اس حدیث پر ہو تو وہ قوی ہوتی ہے۔

الدر المنثور دار المعرفہ بیروت (۵: ۴۱۔۴۳) میں ابن مسعود پھر ابن عباس اور ان کے ہم خیال تابعین عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء، قتادہ اور ابن جریج کے اقوال کا ذکر ہے۔ پھر اس روایت کو نقل کیا گیا ہے جو حضرت عائشہ سے طبری نے روایت کی ہے اور جس کا مضمون وہی ہے جو ابوداؤد کی روایت کا۔ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد جلال الدین السیوطی نے ابوداؤد کی زیر بحث روایت کو بھی تائیداً نقل کیا ہے۔

روح المعانی مطبوعہ دار الفکر (۹: ۱۴۰۔۱۴۱) میں لکھا ہے کہ ''امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ زینت ظاہرہ کا موقع اور محل، چہرہ، ہاتھ اور پاؤں ہیں۔ یہ مطلقاً ستر میں شامل نہیں اور ان کی طرف دیکھنا بھی حرام نہیں۔ ابوداؤد، ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے (اس کے بعد زیر بحث روایت کا پورا متن نقل کیا گیا ہے)۔ ابن ابی شیبہ اور عبد بن حمید نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ کے قول 'الا ما ظھر منھا' سے مراد چہرے کی ٹکڑی اور ہتھیلیوں کا اندرونی حصہ ہے۔ ان دونوں نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ہیں۔ ان دونوں (ابن عباس اور ابن عمر) کے نزدیک غالباً پاؤں بھی ہاتھوں کی مانند ہیں، مگر قیاس پر اکتفا کرتے ہوئے انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ ان کے چھپانے میں ہاتھوں سے بڑھ کر تنگی محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر عرب کی ان تنگ دست اور محتاج عورتوں کو جنھیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے راستوں پر چلنا پڑتا ہے۔''

قابل غور بات یہ ہے کہ صاحب روح المعانی نے زیر بحث آیت کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اور ابن عباس اور ابن عمر کے اقوال سے اس روایت کی تائید کی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے زمخشری کی طرح پردے کے احکام میں تنگ دست عورتوں کی مشکلات کو پیش نظر رکھا ہے۔ آج کل کے داعیان شرعی پردہ کی طرح اسے شہروں میں رہنے والے پانچ فی صد طبقات تک محدود نہیں کیا۔

سید قطب فی ظلال القرآن (۴: ۲۵۱۲) میں فرماتے ہیں کہ جہاں تک چہرے اور ہاتھوں کا تعلق ہے ان کا ظاہر کرنا جائز ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے فرمایا۔ آگے انھوں نے زیر بحث روایت کا حوالہ دیا ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری (۶: ۴۹۳) میں فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ، مالک، احمد اور شافعی کے نزدیک چہرہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ترمذی نے عبداللہ بن مسلم بن ھرمز کے واسطہ سے سعید بن جبیر اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ظاہری زینت سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ عطاء نے حضرت عائشہ سے اسی قسم کی روایت کی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مستثنیٰ چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ہیں۔ امام شافعی کا مشہور قول ہے کہ مراد صرف چہرہ ہے، کیونکہ طبرانی نے مسلم الاعور کے واسطے سے سعید بن جبیر اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد سرمہ ہے۔ اس کی موافقت وہ روایت کرتی ہے جسے بیہقی نے حفیف سے انھوں نے عکرمہ سے اور انھوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ چہرہ تو متفقہ طور پر علما کے نزدیک مستثنیٰ ہے اور دونوں ہاتھوں کو امام ابوحنیفہ اور مالک نے اور امام شافعی اور احمد نے اپنے ایک ایک قول میں مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ ''مردوں کے لیے اجنبی عورت کا صرف چہرہ اور ہاتھ دیکھنے جائز ہیں، کیونکہ اللہ نے 'الا ما ظهر منها' فرمایا اور کیونکہ مردوں کے ساتھ اسے اپنا چہرہ اور ہاتھ کھولنے پڑتے ہیں۔ اور اگر آدمی کو شہوت کا خطرہ ہو تو وہ صرف گواہی اور عدالتی معاملات میں اسے دیکھے۔ میرا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تائید ابوداؤد کی مرسل روایت کرتی ہے۔''

قاضی صاحب نے زیر بحث روایت سے دلیل پکڑتے ہوئے ظاہری زینت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور سب ائمہ کا مسلک کھول کر بیان کیا ہے۔ انھوں نے سنن ابی داؤد کی روایت کو بطور حجت استعمال کیا ہے۔ جہاں تک اس شرط کا تعلق ہے کہ مرد اجنبی عورت کو شہوت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا تو یہ ایک نہایت ہی معقول شرط ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاشرہ کے سب مرد شہوت پرست ہیں اور وہ ہر عورت کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا یہ کہ ان شہوت پرست مردوں کو کنٹرول کرنے کی بجائے عورت کو سوسائٹی سے نکال باہر کیا جائے۔ اس بات کو تفصیلاً فتنہ کی تشریح کے تحت بیان کروں گا۔

محمد دروزہ التفسیر الحدیث (۱۰:۴۴) میں کہتے ہیں کہ 'الا ما ظهر منها' سے مراد وہ چیز ہے جو عادتاً کھلی رہے، جیسا کہ چہرہ اور ہاتھ یا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انگوٹھی، مہندی اور سرمہ اور کپڑے... مردوں کو جو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اس بات پر پرزور دلالت کرتا ہے کہ اس زمانے میں رواج کیا تھا اور وہ آیت کے اس مفہوم پر بھی دلالت کرتا ہے کہ عورت کھلے چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ تلاش رزق، کام کاج اور جائز ضرورتیں پوری کرنے کے لیے باہر نکل سکتی ہے۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں پھر سنت متواترہ سے ثابت ہے کہ عورت کھلے چہرے کے ساتھ نماز پڑھتی اور حج کرتی آرہی ہے۔ انھوں نے تائیداً حضرت عائشہ کی اس روایت کو بیان کیا ہے جسے امام طبری نے نقل کیا ہے اور جس کا

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

مضمون ہو بہو سنن ابی داؤد کی روایت کی طرح ہے۔ بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد محمد دروزہ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ صاحب مضمون کھلے دل و دماغ کے ساتھ اس بحث کو ضرور پڑھیں گے، کیونکہ یہ تفسیر قرآن اکیڈمی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

تفسیر مجاہد مطبوعہ مجمع البحوث الاسلامیہ (۴۴) میں ہے کہ عبدالرحمان نے کہا ہمیں حدیث سنائی ابراہیم نے اس کو حدیث سنائی آدم نے اس نے کہا ہمیں حدیث سنائی عقبۃ الاصم نے انھوں نے عطاء بن ابی رباح سے سنی انھوں نے ام المومنین عائشہ سے کہ 'الا ما ظھر منھا' کے بارے میں ان کا قول ہے کہ جو اس میں سے ظاہر ہو جائے یعنی چہرہ اور ہتھیلیاں۔

نظم الدرر مطبوعہ دار الکتب العلمیہ (۵:۲۲۸) میں 'الا ما ظھر منھا' کی تفسیر یوں ہے یعنی ''جو بغیر قصد کے ظاہر ہو جائے اور جس کے چھپانے میں دقت محسوس ہو جیسے کنگن، انگوٹھی اور سرمہ، کیونکہ عورت کو چیزیں لینے دینے کے لیے ہاتھ اور شہادت وغیرہ کے لیے چہرہ کھلا رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

التفسیر الواضح محمد محمود حجازی مطبوعہ دار الجیل (۱۱:۶۴) میں اسی جملے کی تفسیر یہ ہے ''سوائے اس کے جو ضروریات پوری کرنے کے لیے کھلے رہتے ہیں جیسے چہرہ اور ہاتھ جن کو کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

تفسیر 'غرائب القرآن مکتبة دار الباز مكة المكرمة لصاحبه نظام الدين الحسن بن محمد بن الحسين القمر النيسابوری' (۷۳۸ھ) (۵:۱۸۱) میں ہے: ''سوائے اس کے جسے انسان عادت جاریہ کے طور پر کھلا رکھتا ہے جو آزاد عورتوں میں چہرہ اور ہاتھ ہیں اور لونڈیوں میں ہر وہ چیز جو کام کاج کے لیے کھلی رہے۔''

طنطاوی جوھری اپنی تفسیر الجواھر دار الفکر (۱۱:۱۲) میں 'الا ما ظھر منھا' کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ''سوائے اس کے جسے چیزیں لیتے دیتے وقت کھلا رہنا پڑے جیسے کپڑے، انگوٹھی، سرمہ، ہاتھ کی مہندی، چہرہ اور پاؤں۔ کیونکہ ان کو چھپانا رکاوٹ اور تنگی کا سبب بنتا ہے۔ عورت چیز کو ہاتھ ہی سے پکڑے گی۔ پھر شہادت، معالجے اور تجارتی لین دین میں اسے چہرہ کھلا رکھنا پڑے گا۔ یہ سب اس وقت تک جب تک فتنہ کا ڈر نہ ہو گر نہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لے۔'' یعنی فتنہ کی صورت میں واجب یہ ہے کہ مرد نگاہیں نیچی کرے نہ کہ یہ کہ عورت چہرہ چھپا لے۔

التفسیر الوسیط الدکتور وھبۃ الزحیلی دار الفکر (۲:۱۷۴۸) میں ہے: عورتیں اپنے مواقع زینت اجنبیوں کے سامنے ظاہر نہ کریں بجز اس کے جو عادتاً ظاہر ہو جائے اور وہ چہرہ، ہاتھ اور کپڑے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں، بشرطیکہ فتنہ کا باعث نہ ہوں۔ پھر وہ ابن عطیہ کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں جو غالباً کھلے رہتے ہیں (امام قرطبی نے بھی یہی کہا ہے)۔اخلاقی بگاڑ کے پیش نظر احتیاط اچھی چیز ہے۔خوبرو عورت کا نامحرم کے سامنے نہ آنا اچھی بات ہے۔ڈاکٹر وحید دور جدید کے محقق ہیں جن کو فقہ پر دسترس حاصل ہے، وہ صرف بعض مالکی فقہا کی مانند صرف خوبرو عورت پر نامحرم کی نظر کو برسبیل احتیاط اچھا نہیں سمجھتے یعنی وہ اسے واجب قرار نہیں دیتے۔

سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۰ کی تفسیر کے سلسلہ میں میں نے قدیم وجدید بیس تفسیروں کا حوالہ دیا ہے۔ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں سے بیش تر نے اس تفسیر میں ابوداؤد یا امام طبری کی حضرت عائشہ کی روایت سے اور تقریباً سب نے ابن عباس کے قول سے استدلال کیا ہے۔مجاہد اور ابن ابی حاتم رازی کی تفسیر سے تو ظاہر ہے کہ جمہور صحابہ اور تابعین نے ابن عباس اور ابن عمر کے قول کی تائید کی ہے۔سب کا موقف یہی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں، کیونکہ ان کے چھپانے میں تکلف سے کام لینا پڑتا ہے اور تنگی محسوس ہوتی ہے۔فتنہ کی صورت میں نگاہیں نیچی کرنا واجب ہے نہ کہ چہرہ چھپانا۔غض بصر کا حکم اللہ نے اس فتنے کو روکنے کے لیے صادر فرمایا ہے۔جن دو ایک مفسرین نے چہرہ چھپانے کا مشورہ دیا ہے انھوں نے بھی اس حکم کو خوب صورت عورت تک محدود کر کے مناسب قرار دیا ہے اسے واجب قرار نہیں دیا۔قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تو واضح کر دیا کہ یہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور امام احمد (کا ایک قول) کا مذہب ہے۔مگر ہمارے حافظ صاحب (صاحب مضمون) اقوال صحابہ، تابعین، جمہور علما اور مفسرین کی رائے کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے اس بات پر مصر ہیں کہ چہرے کا چھپانا واجب ہے:

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

اس بات کا افسوس ہے کہ چوتھی دلیل کے ابطال کا جواب دراز تر ہو گیا ہے:

حکایت لذیذ بود دراز تر گفتم

پانچویں دلیل: صاحب مضمون نے پانچویں دلیل کے طور پر جس روایت کا ابطال کیا ہے۔اسے صحیح مسلم نے ''کتاب الطلاق'' اور ''کتاب الفتن'' دو جگہ روایت کیا ہے۔روایت یہ ہے کہ فاطمہ بنت قیس کو تین طلاقیں ہو چکی تھیں۔اس کی عدت کا مسئلہ تھا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اسے ام شریک کے گھر میں عدت گزارنے کا مشورہ دیا۔فاطمہ نے کہا میں ایسا ہی کروں گی۔پھر آپ نے اسے ایسا کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ ام شریک انصار کی ایک صاحب حیثیت عورت تھیں۔ان کے یہاں صحابہ کا کثرت سے آنا جانا تھا۔آپ نے فرمایا: مجھے یہ پسند نہیں کہ تمھاری اوڑھنی سر سے لڑھک جائے یا پنڈلیاں ننگی ہو جائیں اور ان پر ان لوگوں کی نظر پڑے، اس لیے تم اپنے

چچازاد عبداللہ بن عمرو بن ام مکتوم کے یہاں عدت گزارو کیونکہ وہ نابینا ہیں، اس لیے تم ان کی موجودگی میں کپڑے اتار سکتی ہو۔ اور جب تم اوڑھنی اتاروگی تو وہ تمھیں دیکھ نہیں سکیں گے۔

علامہ ناصر الدین البانی نے ''جلباب المراۃ المسلمۃ'' صفحہ ۶۰ سے لے کر ۷۳ تک پیش کردہ تیرہ احادیث میں زیر بحث حدیث کو صفحہ ۶۶ پر پانچویں نمبر پر پیش کیا ہے اور وجہ دلالت یہ پیش کی ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس کی بیٹی کی اس بات کو تسلیم کیا ہے (صاحب مضمون نے حسب عادت 'اَقَرَّ بِہٖ ' کا ترجمہ ''یہ بات سمجھائی'' غلط کیا ہے) کہ سر پر اوڑھنی لیے لوگ اس کو دیکھیں اور خمار سر پوش ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح سر کو ڈھانپنا واجب ہے اس طرح چہرے کو ڈھانپنا واجب نہیں، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر تھا کہ کہیں دوپٹا سر سے نیچے نہ گر جائے اور وہ چیز ظاہر نہ ہو جائے جسے منصوص طور پر ظاہر کرنا حرام ہے۔ چنانچہ آپ نے فاطمہ بنت قیس کو اس بات کا حکم دیا جو ان کے لیے زیادہ محفوظ اور محتاط تھی۔''

www.javedahmadghamidi.com

علامہ البانی کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیس کو ام شریک کے گھر میں عدت گزارنے سے روک کر انھیں ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم محض اس لیے دیا کہ ام شریک کے گھر میں مہمان کثرت سے آتے جاتے تھے، اس لیے احتمال تھا کہ وہ اسے اس حالت میں دیکھ لیں کہ ان کا سر ننگا ہو اس کے برعکس ابن ام مکتوم اگرچہ مرد ہے، مگر نابینا ہے اس لیے اس بات کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ انھیں اس حالت میں دیکھ لے۔ زیر بحث روایت میں یہ دلیل واضح طور پر نظر آ رہی ہے۔ قاضی عیاض 'اکمال العلم بفوائد مسلم' (۵:۵۶) میں فرماتے ہیں کہ ''ام شریک کے یہاں مہمانوں کے طول قیام کی وجہ سے بار بار نظر پڑنے کا اندیشہ تھا جس سے فاطمہ بنت قیس کو تنگی محسوس ہوتی اور ان کی طبیعت میں گھٹن پیدا ہوتی۔'' امام نووی ''کتاب الطلاق'' کی روایت کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ''صحابہ ام شریک کے گھر میں مہمان بن کر کثرت سے اس لیے آتے جاتے تھے، کیونکہ وہ صالح عورت تھی۔'' صحابہ غالباً تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ جہاں لوگ کثرت سے آتے جاتے ہوں، وہاں ایک خاتون کا قیام خود اس کے لیے مشکل پیدا کرتا ہے گھر میں عورت ہر وقت اوڑھنی لیے نہیں رہتی۔ کبھی نہ کبھی تو سر سے دوپٹا سرک جاتا ہے۔ بس اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں وہاں عدت گزارنے کی اجازت نہ دی حالاں کہ وہ عورت تھیں اور ابن ام مکتوم مرد۔ امام طبرانی کی روایت میں تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ روایت یوں ہے: 'وامرنی ان اکون عند ابن ام مکتوم فانہ مکفوف البصر لا یرانی حین اخلع خماری'' ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ابن ام مکتوم کے یہاں چلی جاؤں، کیونکہ

وہ نابینا ہیں اور جب میں اوڑھنی اتاروں گی تو وہ مجھے دیکھ نہیں پائیں گے۔''

صاحب مضمون کے سر میں کیونکہ چہرے کو چھپانے کا سودا سمایا ہوا ہے، اس لیے انھوں نے بے سوچے سمجھے یہ بات کہہ دی ہے کہ روایت میں یہ بات واضح نہیں کہ چادر (یہ خمار کا غلط ترجمہ ہے) چہرے سے گری ہے یا سر سے، سبحان اللہ کیا مضحکہ خیز بات کہی ہے۔ سقوط کا لفظ بتا رہا ہے کہ چیز اوپر سے نیچے گری ہے۔ دوپٹا یا اوڑھنی سر سے تو گر سکتی ہے یہ چہرے سے گرنا بے معنی سی بات ہے۔ خدارا اپنے غیر معقول موقف کی حمایت میں عقل وفہم کا دامن تو نہ چھوڑیں۔

مضمون نویس کو روایت کی توجیہ کے لیے اور تو کوئی بات ملی نہیں انھوں نے ناحق لفظ 'خمار' کے بارے میں بحث چھیڑ دی ہے۔ حالاں کہ لغت کے بارے میں ان کا علم واجبی سا ہے۔ میں نے جواب آں غزل میں لفظ 'خمار' پر تفصیلی بحث کی ہے جس میں لغت اور حدیث کی رو سے اس کے معنوں کا تعین کر دیا ہے۔ صاحب مضمون نے ایک سوال کیا ہے کہ جلباب یا 'خمار' کے الفاظ سر کی چادر کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو اس سے اس بات کی نفی کیسے ہو جاتی ہے کہ اب یہ چادر چہرہ چھپانے کے لیے استعمال نہیں ہوسکتی؟ سوال کا جواب دینے سے پیش تر یہ بات بتاتا چلوں کہ 'خمار' اور جلباب ایک چیز نہیں۔ ان کی لمبائی اور دبازت میں کافی فرق ہے۔ 'خمار' اوڑھنی یا دوپٹے کو کہا جاتا ہے جو نسبتاً چھوٹا اور کم موٹا ہوتا ہے، جبکہ جلباب کے ایک معنی چادر بھی ہیں جو نسبتاً لمبی اور زیادہ موٹی ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھار عورتیں اوڑھنی کو چہرے پر بھی ڈال لیتی ہیں، مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ اوڑھنی عادتاً چہرہ ڈھانپنے کے لیے استعمال ہوتی ہے؟ یہ بالکل ایسے ہے کہ بعض اوقات خواتین شرم وحیا کے باعث دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہیں تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ چہرہ ڈھانپنے کے لیے ہیں؟ کسی چیز کا مفہوم اس کے عام استعمال سے لیا جاتا ہے نہ کہ خاص استعمال سے۔ اس لیے سب لغت نویسوں، مفسروں، محدثوں اور فقہا نے اس کے معنی سر پوش کے لکھے ہیں۔ ابن الاثیر نے ''نہایہ'' (۲:۷۸) میں ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ 'کان یمسح علی الخف و الخمار' ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موزوں پر اور خمار پر مسح کرتے تھے۔'' یعنی پگڑی پر مسح کرتے تھے، کیونکہ مرد پگڑی سے اس طرح سر ڈھانپ لیتے ہیں جس طرح عورت 'خمار' (اوڑھنی) سے سر ڈھانپتی ہے۔ اسی لیے حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ خمار عورت کے لیے ایسے ہے جیسے مرد کے لیے پگڑی۔ کیا مرد اگر پگڑی کی دم اپنے منہ پر ڈال لیں تو یہ کہا جائے گا کہ پگڑی منہ ڈھانپنے کے لیے استعمال ہوتی ہے؟

یہی موقف علامہ البانی کا ہے جو ''جلباب المراۃ'' کے صفحہ ۷ پر لکھتے ہیں: ''میں نے قدیم وجدید ہر میدان کے علما کے اقوال کی تحقیق کی ہے جن کا اس بات پر اجماع ہے کہ 'خمار' سر پوش ہے۔ اور اپنی ''کتاب الرد المفحم'' میں ایسے بیس علما کا نام لیا ہے ان میں ائمہ بھی ہیں اور حفاظ بھی اور انھی میں ابو الولید الباجی (المتوفی ۴۷۴ھ) ہیں (اللہ ان کو جزائے خیر دے) ان کا قول ہے 'لا یظهر منها غیر دور وجهها' یعنی ''خمار' میں سے صرف چہرے کی ٹکڑی نظر آتی ہے۔''

علامہ البانی نے ''جلباب المراۃ المسلمہ'' میں صفحہ ۷۳ کے حاشیہ میں قاضی ابو علی تنوخی کے حوالہ سے عربی کے دو شعر نقل کیے ہیں نہ کہ ایک شعر جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے۔ ان اشعار میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ ''محبوب نے اپنے چہرے پر بھی اوڑھنی ڈالی ہوئی تھی۔'' اردو ترجمہ میں مضمون نگار نے 'خمار' کا ترجمہ چادر کر کے اپنی بے ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ چادر کے نیچے دونور جمع ہوتے ہوئے کیسے نظر آ سکتے ہیں؟ صرف باریک اور شفاف اوڑھنی سے رخساروں کا نور نظر آ سکتا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ صاحب مضمون چہرہ چھپانے کے باطل تصور کی وجہ سے شعر بھی سمجھ نہیں پا رہے۔

صاحب مضمون نے ان اشعار پر علامہ البانی کے تبصرہ کو قلم زد کر کے علمی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔ علامہ لکھتے ہیں کہ یہ اشعار ان معانی سے متصادم نہیں جو ہم نے 'خمار' کے لکھے ہیں۔ یعنی 'خمار' کے لوازمات میں سے عادتاً سر چھپانا ہے کبھی کبھی اسے چہرہ پر ڈال لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے چہرہ چھپایا جاتا تھا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین صفیہ کو اپنے پیچھے سوار کیا تو اپنی چادر ان کے پیچھے اور چہرے پر ڈال دی... اور واقعۂ افک میں حضرت عائشہ کا قول کہ میں نے جلباب سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ کیا ان روایات سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چادر اور جلباب دو ایسے کپڑے ہیں جن سے عام طور پر چہرہ ڈھانپا جاتا ہے؟ اسی طرح شاعر نے اپنی خوب صورت محبوبہ کا وصف بیان کیا ہے۔ کیا اس سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ 'خمار' کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ساتھ سر اور چہرے کو ڈھانپتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھار اس سے چہرہ ڈھانپ لیا جاتا ہے جیسا کہ کبھی کبھی کپڑوں میں سے کسی اور چیز مثلاً چادر، جلباب اور دھاری دار کپڑے وغیرہ سے چہرہ ڈھانپ لیا جاتا ہے۔ یہ توجیہ اس صورت میں ہے کہ ہم شاعر کے وصف کو حقیقی تصور کریں۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ شاعرانہ خیالی تصور ہے، اس لیے اسے حقیقی معنوں پر محمول کرنا ناممکن ہے۔ یہ رہا علامہ البانی کا ان اشعار

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پر تبصرہ اس کی روشنی میں صاحب مضمون کے اس نقلی استدلال کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو صاحب مضمون اس بات کو سمجھ نہیں پائے کہ شاعر صاف وشفاف اوڑھنی کے نیچے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کر رہا ہے۔ شعر کا مضمون بالکل وہی ہے جو اردو کے اس مصرع کا ہے:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

اور صاحب مضمون چلے ہیں اس سے شریعت کا مسئلہ حل کرنے۔

مضمون نگار نے زیر بحث روایت کے اس پہلو پر غور نہیں کیا جو ان کے موقف کی کلیتہً نفی کرتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ام شریک ایک مال دار اور امام نووی کی توضیح کے مطابق نیکوکار عورت تھی جس کے یہاں صحابۂ کرام کثرت سے آتے جاتے تھے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد عورت کے یہاں آ جا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اس کے بارے میں مطمئن ہوں۔ یہ بات ان لوگوں کو کیسے گوارا ہو سکتی ہے جو صاحب مضمون کی طرح عورت کو سات پردوں میں چھپا کر معاشرے سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔

چھٹی دلیل: افسوس اس بات کا ہے کہ صاحب مضمون نے علامہ البانی کی پیش کردہ تیرہ احادیث یا دلائل میں سے صرف پانچ حدیثوں یا دلیلوں پر خامہ فرسائی کی اور اس کے بعد ان کے ترکش کے سارے تیر ختم ہو گئے۔ چھٹی دلیل میں ان کی بے بسی، بے چارگی اور شکست خوردگی سے میں بہت محظوظ ہوا ہوں۔ ابن عباس نے جزُ الا ما ظهر منها' کی تفسیر کی ہے اس سے زچ ہو کر انھوں نے تقریباً رونا شروع کر دیا ہے۔

ابن عباس کے قول کی سند کے بارے میں صاحب مضمون کے اعتراض کا جواب پہلے دے چکا ہوں۔ حال ہی میں ناقد حدیث ابن ابی حاتم رازی کی تفسیر مطبوعہ مکہ مکرمہ (۸:۴:۲۵۷۔۲۵۷۵) دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں تین اقوال سند کے ساتھ نقل کیے ہیں۔

سب سے پہلا قول الاشج، ابن نمیر، اعمش، سعید بن جبیر اور ابن عباس کی سند سے پیش کیا ہے۔ اس کی تائید تیسرے قول سے ہوتی ہے جو انھوں نے یحییٰ بن عبداللہ، ابن لہیعہ، عطاء بن ابی رباح اور سعید بن جبیر کی سند سے روایت کیا ہے، درمیان میں دوسرا قول عبداللہ بن مسعود کا ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ انھوں نے زچ ہو کر ابن عباس کے قول کی ایسی توجیہ کی ہے جو آج تک کسی کان نے نہ سنی اور نہ اس کا خیال کسی بشر کے دل پر گزرا۔ حد یہ ہے کہ جن گنے چنے مفسرین نے ابن مسعود کے قول کو ترجیح دی ہے انھوں نے بھی ابن عباس کے قول کی وہ توجیہ نہیں کی جو مضمون نگار نے کی ہے۔ صاحب مضمون کے نزدیک کہ اس سے مراد

ہوا یا کسی حرکت کی وجہ سے یا اضطراری حالت میں یا کسی ضرورت کے تحت چہرے کا کھولنا ہے۔

سیدھی سی بات ہے زینت کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور مخفی۔ ابن عباس کے قول کے مطابق اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ اور اس پر استعمال ہونے والی زینت ہے۔ یہ زینت عادتاً، فطرتاً اور عبادتاً کھلی رہتی ہے اور اس کے چھپانے کے لیے عورت کو تکلف سے کام لینا پڑتا ہے اور وہ معمول کے کام نہیں کر سکتی۔ ابن عباس نے تو 'الا ما ظهر منها' کے استثنا کی واضح تفسیر کی ہے، مگر مضمون نگار ان کی طرف باطل تاویل کو منسوب کر رہے ہیں۔

آخر میں ابن عطیہ کی تفسیر پر امام قرطبی نے جو تبصرہ کیا ہے اس کا حوالہ دیتے وقت مضمون نگار نے علمی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں اس کا حوالہ پہلے بھی دے چکا ہوں۔ اب بار دگر دے رہا ہوں۔ امام قرطبی لکھتے ہیں: ''یہ قول (یعنی ابن عطیہ کا قول) حسن ہے، مگر عام طور پر چہرے اور ہاتھوں کو عادتاً اور عبادتاً (نماز اور حج میں) کھولنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کا استثنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو ابوداؤد نے سنن میں حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔'' (روایت کا متن اوپر نقل ہو چکا ہے) اس کے بعد امام قرطبی فرماتے ہیں کہ حزم و احتیاط اور لوگوں کے اخلاقی بگاڑ کے پیش نظر یہی قول قوی ہے۔ بس عورت کو اسی زینت کا اظہار کرنا چاہیے جو اس کے چہرے اور ہاتھوں پر ہو۔ کیا میں مضمون نویس سے پوچھ سکتا ہوں کہ انھوں نے کس مصلحت کے تحت قول حسن کہنے کے بعد کی امام قرطبی کی ساری کی ساری عبارت کو قلم زد کر دیا؟ اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

چہرے کا پردہ اور آثار صحابہ

اس عنوان کے تحت صاحب مضمون نے صرف ۵ آثار کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور علامہ البانی کے پیش کردہ ۱۶ آثار کو نظر انداز کر دیا ہے حالاں کہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ وہ ان آثار پر ایک ایک کر کے بحث کرتے۔

ان میں سے تین آثار کا تعلق حالت احرام سے ہے۔ اوپر 'سدل' کی بحث میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان آثار کو چہرے کے پردے کے وجوب کے لیے پیش کرنا کم علمی کی دلیل ہے۔ اثر نمبر۲ جلباب پہننے کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ اوپر واضح کر چکا ہوں کہ پردے کی مقدار کا تعین بعد میں نازل ہونے والی سورت نور میں ہے جو دائمی حکم کو پیش کرتی ہے۔ اثر نمبر۳ سے بھی چہرے کو واجباً چھپانے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اب آیئے اثر نمبر۱، ۴ اور ۵ کی طرف، یہ تینوں آثار عورت کی حالت احرام کے بارے میں ہیں۔ ان سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ احرام کے بغیر عورت کا چہرہ چھپانا واجب ہے۔

آثار نمبر ایک کے بارے میں شارح موطا زرقانی کا قول (۲:۴۳۴) پیش کرتا ہوں کہ ''ابن منذر کا قول ہے کہ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت سارے کا سارا سلا ہوا لباس پہنے اور موزے پہنے۔ اپنا سر اور بال سوائے چہرے کے چھپائے (ہاں) وہ چہرے پر ہلکا سا 'سدل' (یعنی سر کے اوپر سے کپڑا لٹکانا) کر سکتی ہے تاکہ وہ مردوں کی نظروں سے بچی رہے، مگر چہرے کو مت چھپائے۔ فاطمہ بنت منذر کی روایت اس کے خلاف ہے، مگر احتمال یہی ہے کہ اس میں 'تخمیر' (چھپانے) کا لفظ حضرت عائشہ کی روایت کی طرح 'سدل' کے معنوں میں ہے۔'' یہ بات میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔

علامہ ابن عبدالبر ''التمہید'' (۱۵:۱۰۷۔۱۰۹) میں فرماتے ہیں کہ جمہور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ عورت چہرے کو نقاب سے چھپائے سوائے اسماء بنت ابی بکر کی روایت کے کہ وہ حالت احرام میں اپنا چہرہ چھپاتی تھیں اور حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ وہ اگر چاہے تو اپنا چہرہ ڈھانپ لے۔ اور انھی سے یہ روایت بھی ہے کہ وہ چہرہ نہ چھپائے اور لوگوں کا عمل اسی کے مطابق ہے۔ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس کا احرام چہرے میں ہے سر میں نہیں اور وہ حالت احرام میں اپنا سر اور بال چھپائے۔ اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ وہ اپنے چہرے پر اوپر سے ہلکا سا 'سدل' کر سکتی ہے جو اسے مردوں کی نظروں سے بچائے رکھے، لیکن وہ اسے حالت احرام میں چہرہ چھپانے کی اجازت نہیں دیتے سوائے اسماء بنت ابی بکر کی روایت کے اور احتمال یہ ہے کہ اسماء بنت ابی بکر کی روایت میں 'تغطیه' سے مراد حضرت عائشہ کی روایت کی طرح 'سدل' ہے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اب پھر بتاتا ہوں تاکہ:

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

موطا کی شرح ''اوجز المسالك'' (۶:۱۹۷) میں ہے: ابن رشد کا قول ہے کہ چہرے کے چھپانے کے لیے فاطمہ بنت منذر کی روایت کے سوا کچھ بھی موجود نہیں۔ ابن رشد نے اشارہ کیا ہے کہ فاطمہ اس روایت میں منفرد ہیں اور یہ بات اس روایت کو شاذ قرار دیتی ہے۔ ''نیل المآرب'' میں ہے کہ عورت کی طرف سے برقع یا نقاب وغیرہ سے چہرہ چھپانا حالت احرام میں منع ہے، مگر بوقت حاجت سر کے اوپر سے چہرہ پر کپڑا لٹکایا جا سکتا ہے۔ حاجت سے مراد یہ ہے کہ مرد اس سے قریب تر ہوں اور اگر عورت نے بلا حاجت 'سدل' کیا تو وہ فدیہ ادا کرے گی۔

شاہ ولی اللہ نے ''مسوی شرح الموطا'' میں یہی کہا ہے کہ اہل علم کے نزدیک 'سدل' جائز ہے بشرطیکہ کپڑا چہرے کی جلد سے ہٹا رہے۔

'سدل' یہ ہے کہ سر کے اوپر سے لکڑی کے فریم یا کسی اور سہارے سے خفیف سا پردہ لٹکا لیا جائے، مگر وہ چہرے کو

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

ہر گز نہ چھوئے۔ علما نے اس شرط پر اس کی اجازت دی ہے کہ اگر مرد بالکل قریب آ جائے اور دیکھنا شروع کر دے تو اس وقت عورت 'سدل' سے کام لے سکتی ہے۔ اس کا استعمال واجب نہیں صرف اس کی اجازت ہے۔ بہت ہی خال خال عورتیں اس اجازت سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ عام طور پر عورتیں چہرہ کھلا رکھتی ہیں اور یہی سنت متواترہ ہے۔ 'سدل' کو چہرے کے پردے کے وجوب کے لیے دلیل بنانا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ صاحب مضمون نے ان آثار کا حوالہ بار بار دیا ہے، کیونکہ انھیں اس سلسلہ میں معقول دلیل نہیں ملتی۔

اثر نمبر ۴ مضمون نگار نے الاستذکار کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ اگر وہ الاستذکار (۱۱: ۲۷) کو دیکھ لیتے تو ان کو اسے بیان کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: ''فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کا احرام چہرے میں ہے اور اگر مردوں کے بالکل قریب سے گزرنے کی وجہ سے اسے چہرہ چھپانے کی ضرورت پڑے تو اپنے سر کے اوپر سے کپڑا الٹکا لے ('سدل' کرے) کیونکہ حضرت عائشہ اور دیگر عورتوں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایسا کیا تھا۔'' ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'سدل' صرف بوقت ضرورت کیا جا سکتا ہے عام حالات میں نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اثر نمبر ۵ سے ایک اور بات کا پتا چلتا ہے کہ 'خمار' چہرے کو ڈھانپنے کے لیے نہیں ہوتا، کیونکہ حضرت عائشہ نے سر پر سے اوڑھنی کا کچھ حصہ لے کر چہرہ ڈھانپا یعنی 'سدل' کیا۔ یہ بات مضمون نگار کے اس موقف کے منافی ہے کہ 'خمار' (اوڑھنی) چہرہ ڈھانپنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ اثر تلخیص الحبیر سے نقل کیا گیا ہے۔

تلخیص الحبیر (۳: ۲۷۳) میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے رافعی الکبیر کی احادیث کی تخریج کی ہے۔ انھوں نے رافعی الکبیر کے اس قول کا حوالہ دیا ہے کہ اگر عورت کو کسی ضرورت کے تحت چہرہ چھپانے کی حاجت پڑے تو اس کے لیے 'سدل' جائز ہے، لیکن اس پر فدیہ واجب ہے۔ حافظ صاحب نے صرف یہ کہا ہے کہ یہ قول کہ اس پر فدیہ واجب ہے محل نظر ہے۔ انھوں نے اس بات کی تردید نہیں کی کہ وہ صرف بوقت ضرورت 'سدل' کرے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اوپر میں نے حوالہ دیا ہے کہ حافظ ابن حجر 'تغطیہ' سے مراد 'سدل' لیتے ہیں۔ عام حالات میں چہرے کے پردے کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ جہاں تک اثر نمبر ۲ کا تعلق ہے، صاحب مضمون نے سراسیمگی میں غلط اثر کا حوالہ دے دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے حوالہ کہیں سے نقل کیا ہے خود تفسیر طبری میں دیکھا نہیں۔ امام طبری موافق ومخالف، سب آرا کا ذکر کرتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی زیر بحث آیت کے بارے میں انھوں نے تین آثار ابن عباس، عبیدہ اور ابن سیرین سے مروی اس بارے میں پیش کیے ہیں کہ جلباب سے چہرہ چھپانا چاہیے اور ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور ابی صالح سے مروی چار آثار اس بارے میں پیش کیے ہیں کہ جلباب کو صرف پیشانی پر کس

کر باندھا جائے گا۔

صاحب مضمون نے تفسیر میں مذکور تین آثار میں سے صرف دوسرے اثر کا حوالہ دیا ہے جس میں چہرہ ڈھانپنے کا کوئی ذکر نہیں، جبکہ اثر نمبر ایک اور تین میں یہ ذکر واضح طور پر موجود ہے۔

زیر بحث اثر میں تو صرف یہ بات موجود ہے کہ جلباب کو ابن عون نے سر پر اوڑھ لیا (''اچھی طرح اوڑھ لیا۔'' صاحب مضمون نے غلط ترجمہ کیا ہے)۔ اپنی ناک اور بائیں آنکھ چھپا لی اور دائیں آنکھ نکال لی اور اپنی چادر کو اوپر سے اپنے ابرو کے قریب یا اس کے اوپر کر لیا (صاحب مضمون نے غلط طور پر 'أرخی' کا فعل لکھا ہے حالاں کہ طبری کی روایت میں 'أدنـی' کا فعل استعمال ہوا ہے)۔ اب اس ساری روایت میں کہیں بھی چہرہ ڈھانپنے کا ذکر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چہرے کا کچھ حصہ چھپا رہا۔ پھر یہ اثر سورۂ احزاب کی آیت کے متعلق ہے جس میں ایذا رسانی سے بچنے کے لیے ہدایت دی گئی، یہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۰ کی طرح دائمی حکم نہیں جس میں پردے کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ سورۂ نور سورۂ احزاب کے بعد نازل ہوئی ہے۔ صاحب مضمون نے قطعی غلط لکھا ہے کہ علامہ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ نے جس اثر کو ضعیف کہا ہے وہ ابی صالح نے معاویہ سے اس نے علی سے اور اس نے ابن عباس سے روایت کیا ہے جس میں واضح طور پر جلباب سے چہرہ ڈھانپنے اور ایک آنکھ ظاہر کرنے کا حکم ہے۔ (جلباب المراۃ ۸۸) علامہ البانی اس اثر کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابن عباس سے اس اثر کی روایت درست نہیں، کیونکہ طبری نے اسے علی کے طریق سے روایت کیا ہے اور یہ علی ابن ابی طلحہ ہے جیسا کہ ابن کثیر نے اس سے معلق روایت کی ہے۔ اس بات کے باوجود کہ بعض ائمہ نے اس پر تنقید کی ہے اس نے ابن عباس سے سماع نہیں کیا، بلکہ اس نے انھیں دیکھا تک نہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان مجاہد ہے...اور اگر یہ بات درست ہے تو اثر متصل بن جاتا ہے، مگر اثر کا پہلا راوی ابو صالح، عبداللہ بن صالح ہے جو ضعیف ہے۔ ابن جریر نے ابن عباس سے ایک اثر روایت کیا ہے جو اس اثر سے متصادم ہے، لیکن وہ بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے، لیکن ہمیں دوسری صحیح سند کا پتا چلا ہے جو ابن ابی شیبہ نے (المصنف ۴: ۲۸۳) جابر بن زید کے حوالہ سے ابن عباس سے روایت کی ہے۔

میری صاحب مضمون سے گزارش ہے کہ وہ اصل مصدر سے حوالہ دیا کریں۔ تفسیر طبری سے حوالہ دیتے وقت کاش انھوں نے ان چار آثار کو بھی دیکھ لیا ہوتا جو ان کے موقف کی تردید کرتے ہیں۔

اثر نمبر ۳ کو علامہ البانی نے ان ۱۶ آثار میں سے اثر نمبر ۷ (جلباب المراۃ ۹۹) میں پیش کیا ہے جو انھوں نے

چہرے کے پردے کے عدم وجوب کے سلسلہ میں پیش کیے ہیں۔

صاحب مضمون نے اس اثر کا غلط ترجمہ قارئین کو الجھن میں ڈالنے کے لیے کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت عمر نے ہماری ایک لونڈی کو دیکھا جس نے سر پر اوڑھنی لی ہوئی تھی (میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ 'تقنع' کے معنی سر پر اوڑھنی لینا ہے نہ کہ چہرہ چھپانا) حضرت عمر نے اسے مارا اور حکم دیا کہ آزاد عورتوں کی مشابہت نہ کرو۔'' علامہ البانی نے المصنف (۲۳۱/۲) کے حوالہ سے جو اثر نقل کیا ہے اس کی عبارت واضح تر ہے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ مہاجرین یا انصار کی ایک لونڈی حضرت عمر کے یہاں آئی۔ اس نے جلباب اپنے سر پر اوڑھا ہوا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا؟ آزاد ہوگئی ہو کیا؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر یہ جلباب کیوں؟ اسے سر سے اتار دو یہ تو مومنوں کی آزاد عورتوں کے لیے واجب ہے، اس نے پس و پیش کیا۔ آپ درہ لے کر کھڑے ہو گئے اور سر پر مارا یہاں تک کہ اس نے جلباب سر سے اتار دیا۔

علامہ البانی فرماتے ہیں اس اثر کی وجہ استدلال یہ ہے کہ حضرت عمر نے اس لونڈی کو پہچان لیا حالاں کہ وہ جلباب میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ اس کا چہرہ کھلا تھا۔ اور حضرت عمر کا فرمانا کہ جلباب آزاد عورتوں کے لیے ہے، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرت عمر کے نزدیک چہرے کو چھپانا جلباب کی شرط نہ تھی۔ اگر اس زمانے کی ساری عورتیں اپنے چہروں کو جلباب سے چھپاتی ہوتیں تو حضرت عمر یہ بات نہ کہتے۔ پس اس اثر کو عمر کے بیٹے عبداللہ، ابن عباس اور عائشہ کے آثار کے ساتھ شامل کر کے کہنا چاہیے کہ چہرہ ستر میں شامل نہیں۔ سبحان اللہ صاحب مضمون نے ایسا اثر پیش کر دیا جو ان کے موقف کی تردید کرتا ہے۔ عربی لغت سے ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ایسا ہوا۔ علامہ البانی نے جلباب المراۃ کے صفحہ ۹۶ سے لے کر صفحہ ۱۰۳ تک کل ۱۶ آثار پیش کیے ہیں جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عمل ہوتا رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ جس نے ماننا ہو اس کے لیے ایک اثر ہی کافی ہے اور جس نے نہ ماننا ہو اس کے لیے ۱۶ آثار بھی کم ہیں۔

چہرے کا پردہ مذاہب اربعہ کی روشنی میں

میں نے اپنے اصل مضمون اور جواب آں غزل کے تمام مضامین میں جگہ جگہ اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ ائمۂ اربعہ ماسوائے امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے، امام اوزاعی، امام ابن حزم اور جمہور علما کے نزدیک چہرے کا پردہ واجب نہیں۔ صاحب مضمون نے اس بدیہی حقیقت سے انکار کرتے ہوئے حسب معمول حیلہ گری سے کام لینے کی

کوشش کی ہے۔ اسی لیے انھوں نے احناف کے موقف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ متقدمین حنفی فقہا میں سے کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ فتنے کے ڈر سے چہرہ چھپانا چاہیے۔ حنفی فقہ کی امہات الکتب ہدایہ، قدوری، کنز الدقائق، کافیہ، فتح القدیر اور منیۃ المصلی میں صرف یہی عبارت ہے کہ عورت کا سارا بدن بجز چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر ہے۔ ان کتابوں میں فتنے کا دور دور تک بھی کہیں ذکر نہیں اور نہ ہی یہ ذکر امام ابوحنیفہ اور ان کے دو بڑے شاگردوں امام ابویوسف اور امام محمد کے اقوال میں ملتا ہے۔ فتنے کا ذکر صرف متاخرین حنفی فقہا نے کیا ہے۔ اور انھوں نے بھی اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کو فتنہ کے ڈر سے چھپانا جائز ہے نہ کہ ستر کی وجہ سے۔ چنانچہ بعض نے اس چھپانے کو جوان اور خوب صورت عورت تک محدود کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ ہر عورت کے لیے یہ درست نہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا صاحب مضمون حنفی فقہا کے اس متفقہ مسلک کو تسلیم کرتے ہیں کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں؟ اگر وہ اس مسلک کو تسلیم کرتے ہیں تو فھو المراد ہمارا اور ان کا کیا جھگڑا ہے؟ دائمی حکم تو یہی ہے فتنہ تو ایک عارضی شرط ہے۔ یہی احناف کا اصل موقف ہے۔ ابن نجیم ''البحر الرائق'' (مطبوعہ دار المعرفہ ۱: ۲۸۴) میں لکھتے ہیں ''خواہ ابن مسعود نے اس (ظاہری زینت) سے مراد کپڑے لیے ہیں، مگر ابن عباس کا قول ہے کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، جیسا کہ قاضی اسماعیل نے ابن عباس کی حدیث کو جید سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام والی عورت کو نقاب اور دستانے پہننے سے منع کیا ہے، اگر یہ ستر میں شامل ہوتے تو وہ ان کے چھپانے کو حرام قرار نہ دیتے اور چونکہ عورت کو اس بات کی حاجت ہوتی ہے کہ وہ خرید و فروخت کے لیے چہرہ اور لینے دینے کے لیے ہاتھ کھلے رکھے، اس لیے انھیں ستر میں شامل نہیں کیا گیا۔'' ''ہدایہ'' میں چہرے اور ہتھیلیوں کے استثنا کی وجہ یہ بتائی گئی ہے 'للابتلاء بابدائھما' جس کی تشریح فتح القدیر (۱: ۲۲۴-۲۲۵) میں یہ کی گئی ہے کہ ''عورت کے لیے چیزوں کو ہاتھوں سے لینے دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور اسے شہادت اور مقدمات کے لیے چہرہ کھولنا پڑتا ہے۔'' یہی بات جلال الدین الخوارزمی نے کافیہ میں کہی ہے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سیرت صحابہ

محمد وسیم اختر مفتی

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

——— ۶ ———

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جنگ یمامہ میں ۱۲۰۰ مسلمان شہید ہوئے، ان میں سے ۳۹ صحابہ حفاظ قرآن تھے۔ ابھی ایران وروم کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ جاری تھا، حضرت عمر نے یہ سوچ کر کہ کہیں زیادہ تعداد میں حفاظ شہید ہونے سے قرآن کا متن غیر محفوظ نہ ہو جائے، ابوبکر کو مشورہ دیا، قرآن کو اکٹھا کر لیا جائے۔ ان کا جواب تھا: ''تم ایک کام کیسے کر سکتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟'' عمر نے اس موضوع پر ابوبکر سے کئی بار گفتگو کی تو وہ قائل ہو گئے اور عمر کی رائے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں آپ سے پورا قرآن سیکھنے والے صحابی زید بن ثابت کو بلا کر کہا: ''تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی لکھ کر دیا کرتے تھے، اب ہر جگہ سے معلوم کر کے قرآن مجید جمع کرو۔'' چنانچہ زید نے کھجور کی چھالوں، چمڑے کے ٹکڑوں، بکری کے شانے کی ہڈیوں اور سفید پتھر کے ٹکڑوں پر تحریر آیات اکٹھی کیں اور حفاظ سے رجوع کیا۔ اس سعی کے بعد قرآن چمڑے پر یا اس زمانے کے کاغذ پر تحریر ہو کر یکجا ہوا تو ابوبکر کے پاس رکھوا دیا گیا، ان کی وفات کے بعد یہ عمر کے پاس رہا پھر ام المومنین حفصہ بنت عمر کے پاس آ گیا۔ (بخاری، رقم ۴۹۸۶)

ایسی روایات بھی موجود ہیں کہ جمع قرآن کا کارنامہ خلافت فاروقی میں انجام پایا، لیکن اگر بخاری کی اس روایت کو ترجیح دی جائے تو ممکن ہے کہ جمع قرآن کا بیش تر کام خلیفۂ اول کے زمانے میں ہوا ہو اور دوسرے خلیفۂ راشد کے عہد میں اسے اس مصحف کی حتمی شکل دی گئی ہو جو ان کی شہادت کے بعد سیدہ حفصہ کے پاس آ گیا۔ آج قرآن مجید

جس ترتیب سے تلاوت کیا جاتا ہے یہ وہی ترتیب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تلقین فرمائی اور عہد صدیقی میں اس کی تدوین ہوئی۔ ابوبکر نے قرآن کی آیات اور سورتیں ترتیب دینے میں اپنی رائے سے کام نہ لیا جیسا کہ مستشرقین اور بعض مسلمان مورخین کا خیال ہے۔ قرآن کی ترتیب تو توقیفی تھی، ابوبکر کے حکم سے محض اس کے متن کو اس طرح ضبط تحریر میں لایا گیا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم حفاظ صحابہ کو تلقین فرماتے تھے۔ خلیفۂ ثالث عثمان نے ابوبکر کے مصحف ہی کو سامنے رکھ کر متن میں قرأتوں کے اختلاف کو طے کیا، یوں یہ مصحف مصحف عثمانی کہلایا۔ ابوبکر نے جمع قرآن کا جو کارنامہ انجام دیا وہ ان کے ہمیشہ یاد کیے جانے والے کارناموں، مرتدین کی سرکوبی اور عراق و شام کی فتوحات سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ آج جبکہ مملکت اسلامیہ پارہ پارہ ہو چکی ہے، قرآن مجید جوں کا توں محفوظ ہے اور اپنے حق ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

ابوبکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملت اسلامیہ کے لیے اہم ترین مقام رکھتے تھے۔ یہ بات اس وقت کے کفار خوب جانتے تھے اور آج کے مسلمان اور منکر سبھی اس بات سے واقف ہیں۔ غزوۂ احد میں ابوسفیان نے میدان جنگ خالی دیکھا تو پہاڑی پر چڑھ کر پکارا، کیا محمد موجود ہیں؟ جب اسے جواب نہ ملا تو تین بار ابوبکر کا نام لیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دوسری پوزیشن انھی کی ہے۔ ابوبکر کی زندگی اخلاق محمدی سے آراستہ تھی۔ قارہ کے سردار ابن دغنہ نے قریش کے روبرو ابوبکر کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا: ''ابوبکر فقیر ومحتاج کو کما کر دیتے ہیں، صلۂ رحمی کرتے ہیں، محتاجوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور راہ حق میں آنے والی مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔'' (بخاری، رقم ۲۲۹۷) یہ قریباً وہی الفاظ ہیں جو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمائے تھے، جب پہلی وحی نازل ہونے کے بعد آپ پر لرزہ طاری تھا۔ یہ تفصیل تفضیل ابوبکر کی ایک بڑی دلیل ہے۔

خلافت ملنے کے بعد ابوبکر کپڑے کی کچھ چادریں پکڑ کر بازار جانے لگے، راستے میں عمر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ ابوبکر نے کہا: انھیں بیچنے بازار جا رہا ہوں۔ عمر نے کہا: آپ کے کاندھوں پر مسلمانوں کی ذمہ داری کا بوجھ ہے، آپ یہ کاروبار کیسے کر سکتے ہیں؟ سوال آیا: بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟ باہم مشورے سے دونوں بیت المال کے انچارج ابوعبیدہ کے پاس پہنچے۔ انھوں نے امیر المومنین کے لیے ۶ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ روایت بھی ہے کہ جب امور خلافت کے ساتھ کپڑے کا کاروبار سنبھالنا مشکل ہو گیا تو انھوں نے خود وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ پورے زمانۂ خلافت میں سنخ میں ابوبکر کا دیہاتی مکان جو محض ایک

خیمے جتنا تھا اور بالوں سے بنایا گیا تھا، جوں کا توں رہا۔ وہ گھر جو مسجد نبوی اور ابو ایوب انصاری کے پڑوس میں تھا، اس میں بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ خلافت کے پہلے چھ ماہ سنح سے پیدل مدینہ آتے رہے پھر وہ وسط مدینہ میں واقع مکان میں منتقل ہو گئے۔

ابوبکر ایسا کام سرے سے نہ کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو اور وہ عمل ہرگز نہ چھوڑتے جو آپ نے کیا ہو۔ قرآن و سنت ان کی حکومت کی بنیاد تھے، قرآن میں رہنمائی ملتی نہ فرمان رسول ہوتا تو صحابہ کے مجمع میں آ کر دریافت کرتے اور ان کے اجماع پر کاربند ہو جاتے۔ آں حضرت کے بعد ان سے بڑھ کر اجتہاد کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کے شدید احساس نے ان کو جادۂ مستقیم سے ہٹنے نہ دیا، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے خوب مشورہ کرتے، اللہ سے رہنمائی کی دعا مانگتے اور جب عزم پختہ ہو جاتا تو انھیں کوئی تردد نہ ہوتا۔ انھیں ایک مسئلہ درپیش آیا جس کے بارے میں انھوں نے کتاب اللہ میں اصل پائی نہ سنت رسول میں رہنمائی تو فرمایا: میں اپنی رائے اور سوجھ بوجھ کو کام میں لاؤں گا۔ اگر درست فیصلہ ہوا تو اللہ کی جانب سے ہو گا اور اگر غلط ہوا تو میری طرف سے ہو گا۔ میں اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں۔ انھوں نے کئی اجتہادات کیے جن میں سے دادا، دادی کی میراث، کلالہ کی تفسیر اور شراب خور کی حد اہم ترین ہیں۔

ایک شخص نے ابوبکر کو 'یا خلیفۃ اللہ' کہہ کر پکارا تو انھوں نے اسے منع کیا اور فرمایا: میں خلیفۃ اللہ نہیں، بلکہ خلیفۃ رسول اللہ ہوں۔ یہ جملہ ابوبکر کے دور حکومت کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ کا خلیفہ اس معنی میں کہتے تھے کہ رسول اللہ کی لائی ہوئی شریعت کے اوامر و نواہی کے نفاذ اور آپ کی امت کی قیادت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس فرض سے عہدہ برا ہوتے ہوئے ملت اسلامیہ کو وحدت کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اللہ اور رسول کے احکام پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ یہ سلطنت اپنے شہریوں کی اجتماعی رائے کی پابند تھی۔ خلیفۃ اللہ ہونے کا انکار کرنے کا مطلب تھا، قدیم ایران و مصر اور ہندوستان کی مشرکانہ تہذیبوں کے تصور حکمرانی کی نفی کر دی جائے جو بادشاہ کو خدائی نمائندہ سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کی تقدیس اور ان کے حکم کو وحی والہام سمجھنا ایسا تصور ہے جو یورپ میں سترھویں صدی عیسوی تک پایا گیا، لیکن ابوبکر نے صدر اسلام ہی میں اس کا خاتمہ کر دیا، کیونکہ دین توحید اس کی قطعاً گنجایش نہیں رکھتا۔ عمر خلیفہ بنے تو انھوں نے اپنے لیے امیر المومنین کا لقب پسند کیا۔

خلیفۂ اول ابوبکر نے بیت المال کی ذمہ داری ابوعبیدہ بن جراح کو سونپی جنھیں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امین الامت کا لقب عطا فرمایا تھا۔ منصب قضا پر عمر بن خطاب کو بٹھایا جن کا بے لاگ انصاف مشہور ہے، کاتب یا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سیکریٹری جنرل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب خاص زید کو مقرر کیا۔ ان عہدے داروں کے باقاعدہ دفتر تھے نہ متعین اوقات کار۔ ضرورت پیش آنے پر اپنا کام انجام دیا اور پھر دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ ابوبکر کی پالیسی تھی، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تقرریوں کو برقرار رکھا جائے، چنانچہ جب عمر نے مالک بن نویرہ کو قتل کر کے اس کی بیوہ سے میدان جنگ میں شادی رچانے پر خالد کو معزول کرنے کا پرزور مشورہ دیا تو انھوں نے ان کی جگہ کسی اور کو لانے سے انکار کر دیا۔ ابوبکر کی مہر خلافت پر نعم القادر اللہ نقش تھا۔

مدینہ کے محصولات میں خمس بڑی مد تھی، وہ اس مال کو حق داروں تک پہنچانے میں بہت جلدی کرتے۔ بیت المال پہلے ابوبکر کے سنح والے گھر میں تھا، جب وہ مدینہ منتقل ہوئے تو یہ بھی مدینہ منتقل ہو گیا۔ اس پر کوئی چوکیدار مقرر نہ تھا، کیونکہ وہ اس میں قابل ذکر مال موجود نہ رہنے دیتے تھے جس کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ اس پر ایک قفل ڈال دیا جاتا۔ ابوبکر کی وفات کے بعد خلیفۂ ثانی عمر، عبدالرحمان بن عوف اور عثمان بن عفان کے ساتھ ان کے چھوڑے ہوئے بیت المال میں داخل ہوئے تو اسے بالکل خالی پایا۔ فقط ایک کپڑے کی تھیلی ملی جس میں ایک درہم پڑا ہوا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اپنی خلافت کے پہلے سال ابوبکر حج کرنے نہ گئے، انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ رجب ۱۲ھ میں انھوں نے عمرہ کیا، مکہ میں اپنے والد ابوقحافہ سے ملاقات کی جو اسلام لانے کے بعد وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ پھر اسی سال (۱۲ھ) میں ابوبکر امیر المومنین کی حیثیت سے حج کرنے آئے، دار الخلافہ میں ان کی غیر موجودگی کے وقت عثمان بن عفان نائب رہے۔ اجل نے انھیں اپنی خلافت کا تیسرا حج ادا کرنے کا موقع نہ دیا۔ یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کے مطابق تھا جو آپ نے ابوبکر کو سنایا۔ فرمایا: ''اے ابوبکر، میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں اور میں تم سے اڑھائی سیڑھیاں آگے نکل آیا ہوں۔'' انھوں نے جواب دیا، خیر ہو یا رسول اللہ، اللہ آپ کو سلامت رکھے یہاں تک کہ آپ وہ کچھ دیکھ لیں جو آپ کو خوش کرے اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے۔ آپ نے تین دفعہ خواب دہرایا اور ابوبکر نے تینوں بار یہی جواب دیا۔ چوتھی دفعہ ابوبکر نے کہا: ''یا رسول اللہ، اللہ آپ کو اپنی رحمت و مغفرت کی طرف اٹھا لے گا اور میں آپ کے بعد اڑھائی سال جیوں گا۔'' کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ ابوبکر نے اپنی خلافت کے دوران میں حج نہیں کیا۔

ابوبکر کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے عبداللہ (وفات ۱۱ھ) اور اسماء (وفات ۷۴ھ)، دوسری بیوی ام رومان بنت عامر سے عبدالرحمان (وفات ۵۳ھ) اور عائشہ (وفات ۵۸ھ)،

چوتھی بیوی اسماء بنت عمیس سے محمد (قتل کی تاریخ: ۳۸ھ) اور پانچویں بیوی حبیبہ سے ام کلثوم نے جنم لیا۔ان کی بیویوں کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوئی، البتہ نان ونفقے کی کمی ضرور رہی۔اولاد کی حسن تربیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ عائشہ کو جو کم عمری میں بیاہ کر باپ کے گھر سے رخصت ہوئیں، بے شمار اشعار، ضرب الامثال اور خطبے زبانی یاد تھے۔عربوں کے واقعات اور ان کی تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ان کی دوسری بیٹی اسماء ذات النطاقین گھر داری کی خوبیوں کا مرقع تھیں۔باپ نے ان کی مشقت بھری زندگی دیکھی تو ایک خادمہ بھیج دی۔اسماء کی عمر سو برس سے زیادہ تھی اور وہ نابینا ہو چکی تھیں جب حجاج نے ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کو مکہ میں محصور کر دیا۔اس نے صلح کے بدلے گورنری اور مال و دولت دینے کی پیش کش کی۔وہ بوڑھی ماں سے مشورہ کرنے آئے، انھوں نے جگر تھام کر اپنے بیٹے کو جرات دلائی اور مصالحت سے منع کر دیا۔ابوبکر کے بیٹے عبداللہ اور عبدالرحمان شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔عبدالرحمان نے بدر و احد کی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف حصہ لیا اور بعد میں مسلمان ہوئے۔

ابوبکر زمانۂ جاہلیت میں بھی امانت دار تھے، لوگوں کی امانتوں کی حفاظت کرتے اور انھیں وقت پر ادا کرتے پھر خلافت کی امانت کبریٰ کو خوب ادا کیا۔خود فرماتے ہیں: ''ہم نے مسلمانوں کے کھانے میں سے چونی بھوسی استعمال کی اور ان کے موٹے جھوٹے کپڑوں سے تن ڈھانکا۔'' مکہ میں وہ ۴۰ ہزار درہم کے مالک تھے، اسلام کی راہ میں انفاق کرتے کرتے یہ رقم گھٹ کر ۵ ہزار درہم رہ گئی جب انھوں نے مدینہ ہجرت کی۔ہجرت کے فوراً بعد سہیل و سعد کی زمین پر مسجد نبوی تعمیر ہوئی تو زمین کی قیمت ابوبکر نے ادا کی۔رفتہ رفتہ ان کا سب مال اللہ کی راہ میں خرچ ہو گیا۔ ابوبکر پر کامل اعتماد ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مال کو بے تکلف اپنے مال کی طرح خرچ فرماتے تھے۔

سیدنا ابوبکر نے خلافت کی ذمہ داریاں انتہائی تقویٰ و امانت کے ساتھ ادا کیں۔وہ کسی بھی درجے میں خیانت نہ کرنا چاہتے تھے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کی اہلیہ نے حلوہ کھانے کی فرمایش کی تو مسلمانوں کے بیت المال پر بوجھ ڈالنا منظور نہ کیا، بلکہ روزانہ ملنے والے وظیفے میں سے کچھ رقم پس انداز کی تب حلوہ لیا۔زہد و ورع کا حال یہ کہ ایک روز درخت پر چڑیا دیکھی تو کہا: او پرندے، تیری زندگی کیا خوب ہے۔درخت کے پھل کھاتا ہے اور اس کے سایے میں وقت گزارتا ہے۔حساب کتاب کا کچھ کھٹکا نہیں۔کاش، ابوبکر تجھ جیسا ہوتا۔ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے چند سوالات دریافت فرمائے: ''آج روزہ کس نے رکھا؟ جنازے میں شرکت کس نے کی؟ محتاج کو کھانا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کس نے کھلایا؟ بیمار کی تیمارداری کس نے کی؟'' سب کے جواب میں ابوبکر ہی نے ہاں کہا۔آپ نے ارشاد فرمایا: ''یہ اوصاف جس میں جمع ہو جائیں،جنتی ہے۔'' خلیفہ بننے کے بعد ابوبکر عمرہ کرنے گئے تو لوگ احتراماً ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔انھیں ہٹا کر کہا: اپنی اپنی راہ چلو۔ابوبکر اپنا کام خود کرتے ،اونٹ پر سواری کرتے ہوئے نکیل ہاتھ سے گر پڑتی تو خود اتر کر نکیل اٹھاتے۔لوگوں نے کہا: ہم سے کیوں نہیں کہتے؟ جواب دیا: میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا مجھ کو حکم ہے،انسان سے کچھ نہ مانگوں۔خلافت سنبھالنے سے پہلے وہ سنخ سے مدینہ آ کر غریب عورتوں کی بکریاں دوہا کرتے،خلیفہ بنے تو ایک عورت نے کہا: آج ہمارے گھر میں بکریاں دوہنے والا کوئی نہ رہا۔ان کا جواب تھا: میں اب بھی تمھارے جانور دوہتا رہوں گا۔مدینہ کے کنارے پر ایک اندھی محتاج بڑھیا رہتی۔سیدنا عمر اس ارادے سے جاتے کہ اس کی کچھ خدمت کریں۔وہاں پہنچتے تو معلوم ہوتا،کوئی آدمی خدمت کر کے جا چکا ہے۔ایک روز وہ کھوج لگانے کے لیے چھپ کر کھڑے ہو گئے۔وقت مقررہ پر انھوں نے آنے والے شخص کو دیکھا تو وہ ابوبکر تھے۔محلے میں نکلتے تو بچے بابا بابا کہہ کر ابوبکر سے لپٹ جاتے۔ایک سال سردیوں میں انھوں نے کمبل خرید کر مدینہ کے غربا میں بانٹے۔

ابوبکر اپنے گورنروں کی کارروائیوں پر نگاہ رکھنے کے ساتھ رعایا کے حالات سے باخبر رہتے۔مظلوم کی فوراً دادرسی کرتے۔ان کی نصیحتوں میں ان کی طبعی خصوصیت صداقت کے ساتھ ان کی دانش جھلکتی ہے۔ایک کمانڈر کو نصیحت کی کہ لوگوں کی پردہ دری نہ کرنا، بلکہ ان کے ظاہری حالات پر اکتفا کرنا۔جہاں فساد نظر آئے اس کی اصلاح کرنا۔عکرمہ سے کہا کہ جب کچھ کرنے کا وعدہ کرو تو اسے کر گزرو۔کسی جرم کی سزا میں حد سے تجاوز نہ کرنا۔رعایا کو وعظ فرمایا:''سنو،اگر تم مجھ سے تقاضا کرو کہ میں اس طرح کام کروں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرماتے تھے تو میں نہ کر سکوں گا۔آپ کو اللہ نے وحی سے نواز کر معصوم بنایا تھا،میں تم سے بہتر انسان نہیں ہوں، لہٰذا مجھے کچھ چھوٹ اور رعایت دو۔اگر میں درست راہ پر چلوں تو میری پیروی کرو اور اگر مجھے کج راہ ہوتے پاؤ تو سیدھا کر دو۔'' عراق میں مجتمع فوجوں کو ابوبکر نے جو نصیحت کی اسے پڑھ کر ان کے پختہ ایمان کا پتا چلتا ہے۔تم اللہ کے مددگار رہو، جو اللہ کی مدد کرے، اللہ اسے فتح دیتا ہے۔ہزاروں کی جمعیت اگر معصیت کی راہ اختیار کر لے تو بے دست و پا ہو جاتی ہے،لہٰذا گناہوں سے خبردار رہو۔ابوبکر خود مختصر گفتگو کرتے اور دوسروں کو بھی اختصار کلام کی ہدایت کرتے۔یزید بن ابوسفیان کو فرمایا: طویل کلامی بات ذہن سے محو کر دیتی ہے۔

ابوبکر کے چند جامع کلمات: موت سے محبت کرو، زندگی عطا کی جائے گی۔امانت سب سے بڑی سچائی ہے اور

خیانت سب سے بڑا جھوٹ۔ صبر نصف ایمان اور یقین پورا ایمان ہے۔ تعزیت کے بعد مصیبت مصیبت نہیں رہتی۔ اگر کوئی نیکی رہ جائے تو اسے پانے کی کوشش کرو اور جب پالو تو آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ جس سے مشورہ چاہو اس سے کچھ نہ چھپاؤ ورنہ اپنی قبر خود کھودو گے۔

حدود اللہ کے باب میں ان کی احتیاط اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ فرمایا: اگر میں خود کسی کو خدا کی کوئی حد توڑتے ہوئے دیکھوں تو اس وقت تک سزا نہیں دے سکتا جب تک دوسرا گواہ نہ ہو۔ ایک قائد کو وصیت کی کہ ان کا ظاہر قبول کرلو اور باطن ان پر چھوڑ دو۔ ایاس بن عبد یالیل فجاہ کے نام سے مشہور ہے، ابوبکر کے پاس آیا اور مرتدوں سے مقابلے کے لیے اسلحہ مانگا۔ اسے اسلحہ مل گیا تو اس نے ڈاکا زنی اور غارت گری کا پیشہ اختیار کرلیا، پھر جب وہ گرفتار ہو کر خلیفۂ اول کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے بقیع کے مقام پر بھڑکتے ہوئے الاؤ میں جھونکنے کا حکم دیا۔ یہ واحد واقعہ ایسا ہے جسے ابوبکر کے بردباری، تحمل اور دوراندیشی پر مبنی دور حکومت کے غیر موافق کہا جا سکتا ہے۔ مستشرقین نے اس واقعہ کو خوب اچھالا ہے، حالانکہ اس فیصلے کی بنیاد قرآن مجید میں پائی جاتی ہے: 'انما جزاؤا الذین یحاربون اللّٰہ ورسولہ و یسعون فی الارض فساداان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض'' ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ بری طرح قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں مملکت سے جلا وطن کر دیا جائے۔'' (المائدہ ۵: ۳۳) تقتیل میں جلانا بھی شامل ہوسکتا ہے۔ اسلامی مملکت کا اسلحہ لے کر اسے مملکت ہی میں بدامنی پھیلانے کے لیے استعمال کرنے سے بڑا فساد کیا ہوسکتا تھا، لیکن ابوبکر نے اس ڈاکو کو دی جانے والی سزا کو اپنی فروگزاشت سمجھا۔ وہ اس واقعے پر افسوس کرتے رہے اور ایک بار کہا: کاش میں نے فجاہ سلمی کو جلانے کی بجائے قتل کر دیا یا زندہ چھوڑ دیا ہوتا۔ عمرو بن عاص نے شام سے بنان کا سر کاٹ کر بھیجا تو ابوبکر نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ آیندہ محض فتح کی اطلاع ارسال کی جائے، ہرگز کسی کا سر میرے پاس نہ بھیجا جائے۔

ابوبکر کا بدن دبلا اور قدرے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ پہلوؤں میں گوشت کم تھا جس کی وجہ سے تہ بند نیچے لٹک آتا۔ رنگ سفید، گال کمزور اور ڈاڑھی خشخشی تھی۔ پیشانی فراخ اور اونچی تھی، آنکھیں گہری اور روشن تھیں، بال گھنگریالے تھے۔ ابوبکر کی آواز دردناک تھی، وہ سنجیدہ اور کم گو تھے۔ بالوں کو مہندی اور وسمہ لگاتے جس سے ان کی ڈاڑھی گہری سرخ نظر آتی۔ یہ معمول انھوں نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد اپنایا، اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

میں صرف ابوبکر ہی تھے جن کے بال کھچڑی تھے۔ اتنے لاغر ونحیف ابوبکر کو مشرکوں نے ابوالفصیل (اللہ میاں کی گائے) کا نام دیا تھا۔ انھی کے کاندھوں پر بار خلافت پڑا تو وہ ابوالفحول (شیرنر) ثابت ہوئے۔ خالد بن ولید نے بھی جنگ ارتداد میں بعض مواقع پر نرم پالیسی اختیار کرنا چاہی، لیکن ابوبکر نے پورا قصاص لینے کی ہدایت کی۔ عمر نے منکرین زکوٰۃ سے نرمی برتنے کا مشورہ دیا تو بھی وہ اپنے موقف پر قائم رہے۔ ان کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملنے والی سند کافی ہے کہ ''جسمانی طور پر کم زور اور اللہ کے معاملے میں انتہائی طاقت ور۔'' بوڑھے ہو کر وہ اور ضعیف ہو گئے، لیکن ان کی ہر فضیلت زیادہ توانا ہو گئی۔ ابوبکر زمانۂ جاہلیت میں شعر کہتے تھے: اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا شعری اثاثہ وہ تین مرثیے ہیں جو انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہے۔

ابوبکر نے اصحاب رسول سے نرمی اور مروت کا رویہ اختیار کیا، صحابہ کو ابوبکر سے ایک ہی شکایت ہوئی کہ انھوں نے مال کی تقسیم میں السابقون الاولون، مردوں، عورتوں اور غلاموں میں کوئی امتیاز نہ کیا۔ اس کی وجہ خلیفۂ اول کا اصول تھا کہ مال کی تقسیم میں مساوات ہی زریں اصول ہے، البتہ مراتب اور اجر وذخر دینا اللہ کا کام ہے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ خلافت کے پہلے سال ابوبکر نے مال فے آزاد، غلام، مرد، عورت سب میں برابر تقسیم کیا تو ہر ایک کے حصے ۱۰ دینار آئے۔ اگلے برس یہ رقم دگنی ہو کر ۲۰ دینار ہو گئی۔ ان کی پالیسی تھی کہ کبار صحابہ کو سرکاری مناصب کم سے کم دیے جائیں۔ اس کی ایک وجہ انھوں نے خود بیان کی کہ میں نہیں چاہتا، ان (اہل بدر) کو دنیا میں ملوث کروں۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ ان کو اپنے پاس مدینہ میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ انھیں مشوروں میں شامل رکھیں، کیونکہ جب معاذ بن جبل شام گئے تھے تو اہل مدینہ نے بڑا خلا محسوس کیا تھا، وہ ان سے فقہی و دینی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ تب عمر نے انھیں روکنے کا مشورہ دیا تھا تو ابوبکر نے جواب دیا تھا: جو شخص جہاد کے ذریعے شہادت حاصل کرنا چاہتا ہو میں اس کو کیسے روک سکتا ہوں؟

خلافت ابوبکر میں سیدنا عمر کا بہت اہم کردار رہا، ہر کام ان کے مشورے سے انجام پاتا، تاہم ایسے مواقع بھی آئے جب ابوبکر کو تنہا کھڑا ہونا پڑا خصوصاً جیش اسامہ بھیجتے ہوئے اور منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی کے وقت صرف ابوبکر تھے جنھیں اپنا موقف درست ہونے کا حق الیقین تھا۔ انھوں نے خالد بن ولید کے بارے میں بھی عمر کے بار بار کے مشوروں کو رد کیا۔ ان دونوں کی ہم آہنگی اور ان کی بے مثال حکومتوں کو دیکھ کر انھیں عمرین کا نام دیا گیا۔ جب ابوبکر و عمر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوتے۔ آپ نے فرمایا: ''جو دو میرے بعد

آئیں ان کی پیروی کرو یعنی ابوبکر وعمر۔'' (ترمذی، رقم ۳۶۶۳) حضرت علی فرماتے ہیں: ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ ابوبکر وعمر آئے۔ تب آپ نے فرمایا: ''یہ نبیوں رسولوں کے علاوہ پہلے والے اور بعد میں ہونے والے اہل جنت کے ادھیڑ عمر کے لوگوں کے سردار ہیں، اے علی، ان کو نہ بتانا۔'' (ترمذی، رقم ۳۶۶۵) آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد میں صحابہ کے حلقے میں تشریف فرما تھے کہ علی تشریف لائے۔ سلام کے بعد وہ بیٹھنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے لگے۔ ابوبکر فوراً کھسک گئے اور انھیں نشست دے دی۔ آپ کا چہرہ مبارک دمک اٹھا۔ فرمایا: ''اہل فضل کی فضیلت اصحاب فضل ہی پہچانتے ہیں۔''

سخت مشقت اور اعصاب شکن معمولات نے ابوبکر کی اجل کو دعوت دی۔ کوئی اور انسان اس قدر بوجھ اٹھانے کی طاقت نہ رکھتا تھا جو انھیں اپنے دور خلافت میں اٹھانا پڑا۔ اگرچہ ایسی روایت بھی پائی جاتی ہے کہ یہودیوں نے ان کو دیر سے اثر کرنے والا زہر ملا کر خزیرہ (گوشت جو پانی اور مسالے ڈال کر رات بھر پکایا گیا ہو) کھلا دیا تھا جس سے ان کی وفات ہوئی۔ عتاب بن اسید نے بھی یہ کھانا کھایا تھا، انھوں نے اسی روز مکہ میں انتقال کیا۔ جب ابوبکر کی وفات ہوئی۔ حارث بن کلدہ طبیب تھا، اس نے چند لقمے لے کر کھانا چھوڑ دیا تھا، اس لیے ان کی جان بچ گئی۔ زہری کا کہنا ہے وہ بھی بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ زہر خورانی کی روایت قوی نہیں، اس لیے اسے نہیں مانا گیا۔ سیدہ عائشہ اور عبدالرحمان بن ابوبکر کا بیان ہے کہ ۷ جمادی الثانی ۱۳ھ کو ہوا سرد تھی۔ ابوبکر نے غسل کر لیا تو ان کو بخار چڑھنا شروع ہو گیا۔ ایسے بیمار ہوئے کہ مسجد نہ جا سکتے تھے، چنانچہ عمر کو نماز پڑھانے کا کہا۔ ابوبکر کی وفات کا عیسوی ماہ اگست بنتا ہے، سخت گرمی کے موسم میں ٹھنڈ لگنے والی بات عجیب لگتی ہے، لیکن عام مشاہدہ ہے کہ ہر گرمیوں میں چند دن ٹھنڈے ضرور آتے ہیں۔ ممکن ہے، وہ دن ایسا رہا ہو۔ یہ امکان بھی ہے کہ انھیں ہجرت کے فوراً بعد ہونے والا بخار عود کر آیا ہو یا کوئی نئی بیماری لاحق ہو گئی ہو۔ شدت مرض میں ابوبکر کو طبیب بلانے کا کہا گیا تو ان کا جواب تھا: طبیب نے دیکھ لیا ہے۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ اس نے کیا کہا؟ ابوبکر نے بتایا کہ وہ کہتا ہے: 'انی فعال لما یرید' ''میں جو چاہتا ہوں کر ڈالتا ہوں۔'' سیوطی کہتے ہیں: ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے صدمے سے گھلتے رہے حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

پندرہ دن کی اس بیماری میں وہ اپنا محاسبہ کرتے رہے اور امور خلافت بھی کسی قدر انجام دیے۔ انھیں احساس ہو چکا تھا کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ابوبکر ذاتی طور پر مطمئن اور پرسکون تھے، لیکن مرض الموت میں بھی انھیں مسلمانوں کے معاملات سلجھانے کی فکر رہی۔ انھیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ میرے بعد مسلمان کسی انتشار کا شکار نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی سقیفہ ان کو دوبارہ متحد نہ کر سکتا۔ انھوں نے اہل رائے کو جمع کر کے کہا کہ اللہ نے تمھیں

www.javedahmadghamidi.com

میری بیعت سے آزاد کر دیا ہے، میری زندگی ہی میں جسے چاہو اپنا امیر منتخب کر لو۔ سب نے مشورہ دیا کہ ابوبکر اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کر جائیں۔ ابوبکر کو عمر بن خطاب پر پورا اطمینان تھا، لیکن وہ اپنی رائے مسلمانوں پر ٹھونسنا نہ چاہتے تھے۔ کچھ روز بعد انھوں نے عبدالرحمان بن عوف کو بلا کر مشورہ کیا۔ ان کا جواب تھا: عمر بہترین آدمی ہیں، لیکن ان میں سختی پائی جاتی ہے۔ ابوبکر نے فرمایا: ان کی سختی اس لیے ہے کہ وہ مجھے نرم پاتے ہیں۔ حکومت ان کے پاس ہو گی تو وہ بہت سی باتیں چھوڑ دیں گے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مجھے کسی شخص پر غصہ آتا ہے تو وہ مجھے اس کی طرف سے منانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب میں کسی سے نرمی برتتا ہوں تو مجھے سختی کا مشورہ دیتے ہیں۔ پھر انھوں نے عثمان بن عفان کو بلایا جو ان کے پڑوس میں رہتے تھے اور ان کی رائے طلب کی۔ انھوں نے فرمایا: عمر جیسا ہم میں کوئی نہیں، وہ باطن میں اپنے ظاہر سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کے بعد ابوبکر نے علی، طلحہ، سعید بن زید، اسید بن حضیر اور کئی اور صحابہ سے مشورہ کیا۔ کچھ صحابہ نے ابوبکر کے مشوروں کی خبر پا کر عمر کی مخالفت کرنا چاہی، وہ ان کے پاس حاضر ہوئے۔ طلحہ بن عبیداللہ نے کہا کہ آپ نے دیکھا ہے آپ کے ہوتے ہوئے وہ لوگوں سے کس طرح پیش آتے ہیں؟ آپ نہ ہوں گے تو ان کا کیا سلوک ہو گا؟ ابوبکر کو غصہ آ گیا، شدت مرض سے لیٹے ہوئے تھے، فوراً بٹھانے کو کہا پھر پکار کر کہا: اے اللہ، میں نے تیرے بندوں پر ان میں سے بہترین شخص کو خلیفہ مقرر کیا ہے، طلحہ، میری طرف سے سب کو یہ بتا دو۔ اگلے روز انھوں نے حضرت عثمان سے جانشین کی تقرری کو یوں تحریری شکل دلائی: میں اپنے بعد عمر بن خطاب کو تمھارا خلیفہ مقرر کرتا ہوں، تم ان کی سنو اور مانو۔ اس دوران میں ان کو غشی بھی آئی۔ ان کی اہلیہ اسماء بنت عمیس انھیں سہارا دے کر دروازے تک لے آئیں تو انھوں نے مسجد نبوی میں موجود لوگوں سے اپنے فیصلے کی تائید لی۔ ابوبکر نے عمر کو الگ بلا کر کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ دوران مرض میں ایک روز ابوبکر نے دریافت کیا کہ مجھے بیت المال سے کتنا وظیفہ ملا ہے؟ حساب کیا گیا تو ۶۰۰۰ درہم ہوئے۔ انھوں نے عائشہ کو وصیت کی کہ میری فلاں زمین فروخت کر کے بیت المال کے درہم واپس کر دیے جائیں۔ یہ تحقیقات بھی کیں، بیعت کے بعد میرے مال میں کیا اضافہ ہوا؟ معلوم ہوا ایک حبشی غلام ہے جو بچوں کو کھانا کھلاتا ہے اور فرصت میں تلواریں صیقل کرتا ہے۔ ایک اونٹنی ہے جس پر پانی آتا ہے اور پانچ درہم مالیت کی ایک چادر ہے، چنانچہ انھوں نے وصیت کی کہ میری وفات کے بعد یہ چیزیں خلیفۂ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔ روایات میں ایک خچر، کچھ برتنوں اور ایک چکی کا ذکر ہے، ابوبکر نے یہ بھی بیت المال کے حوالے کرنے کی تلقین کی۔ ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عالیہ (مدینے کا بالائی علاقہ) میں ملنے والی بنو نضیر کی زمین عائشہ کو ہبہ کر چکے تھے، مرض الموت میں انھوں نے عائشہ سے یہ زمین لوٹانے کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

درخواست کی تا کہ یہ سارے وارثوں کے حصے میں آ جائے۔ ان کے ذہن میں حبیبہ بنت خارجہ سے پیدا ہونے والی ام کلثوم تھی جس نے ابھی جنم نہ لیا تھا، انھوں نے اس کے لڑکی ہونے کی پیشین گوئی بھی کر دی۔

عائشہ سے پوچھا گیا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا؟ انھوں نے بتایا تین کپڑوں کا۔ وصیت کی میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہوں، دو چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھو لی جائیں اور ایک کپڑا نیا لے لیا جائے۔ عائشہ نے کہا کہ ہم تنگ دست نہیں کہ نیا کپڑا نہ لے سکیں۔ جواب فرمایا: نئے کپڑوں کی زندہ لوگوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کفن تو لہو اور پیپ کے واسطے ہے۔ عائشہ ہی کی ایک دوسری روایت میں ایک زعفران لگا ہوا کپڑا جو انھوں نے پہن رکھا تھا اور دو نئے کپڑوں کا کفن دینے کا ذکر ہے۔ ابو بکر نے اپنی اہلیہ اسماء بنت عمیس کو غسل دینے کی ہدایت کی اور کہا اگر وہ چاہیں تو ہمارے بیٹے عبدالرحمان سے مدد لے لیں۔ ابو بکر ان وصیتوں میں مصروف تھے کہ عراق سے مثنیٰ آئے اور عراق کمک بھیجنے کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنے جانشین عمر کو وہاں فوج بھیجنے کی وصیت کی اور فرمایا: میری موت کی وجہ سے مسلمانوں کے معاملات سے غافل نہ ہو جانا۔ انتقال کے دن پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس روز رحلت فرمائی تھی؟ لوگوں نے بتایا: پیر کے دن۔ کہا: مجھے امید ہے، میری موت بھی آج ہی ہوگی۔ انھوں نے وصیت کی کہ میری قبر آں حضرت کی قبر کے ساتھ بنائی جائے۔ موت کے آثار طاری ہوئے تو عائشہ پاس تھیں، انھوں نے حاتم طائی کا ایک شعر پڑھا تو ابو بکر ناراض ہوئے۔ ان کے منہ سے نکلنے والے آخری الفاظ یہ تھے: 'رب توفنی مسلمًا و الحقنی بالصالحین'' اے پروردگار، مجھے موت دیجیے مسلمان ہوتے ہوئے اور مجھے ملا دیجیے نیک لوگوں کے ساتھ۔'' انھوں نے ۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ (۲۳ اگست ۶۳۴ء) کو پیر کے دن شام کے وقت وفات پائی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی اہلیہ اسماء اور بیٹے عبدالرحمان نے غسل دیا۔ میت اسی چارپائی پر لٹائی گئی جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک کو تدفین سے پہلے رکھا گیا تھا۔ ریاض الجنہ میں جنازہ رکھا گیا۔ حضرت عمر نے نماز پڑھائی۔ قبر نبوی کے پہلو میں بنائی گئی قبر میں عمر، عثمان، طلحہ اور عبدالرحمان بن ابو بکر نے میت کو اتارا۔ یوں وفات کے چند گھنٹوں بعد اسی رات ان کی تدفین عمل میں آ گئی۔ ابو بکر کے والد ابو قحافہ اپنے بیٹے کا صدمہ دیکھنے کے لیے زندہ تھے، انھوں نے چھ ماہ بعد ۹۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مدینہ کی عورتیں حضرت عائشہ کے گھر اکٹھی ہو کر بین کرنے لگیں تو عمر نے ان کو زبردستی روکا۔ ۲ سال ۳ ماہ ۱۱ (یا ۱۲) دن ابو بکر کی مدت خلافت بنتی ہے۔

ابو بکر سے مروی روایتیں ۱۴۲ ہیں، ان میں سے صرف ۷ بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔ قلت روایت کا سبب شاید ان کی کم گوئی ہے۔ اس کے باوجود بعض اہم روایات ان سے مروی ہیں، مثلاً طریقۂ نماز جو ابو بکر سے ابن زبیر نے

سیکھا،ان سے عطا نے اوران سے ابن جریج نے جو اپنے زمانے میں بہترین طریقے سے نماز ادا کرنے والے تھے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی مقداریں بیان کرنے والی حدیث ابوبکر سے مروی ہے۔فن تعبیر کے امام ابن سیرین کہتے ہیں کہ اس امت میں خوابوں کی تعبیر بتانے والے سب سے بڑے ماہر ابوبکر تھے۔ ابوبکر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی،ان سے روایت کرنے والوں میں عمر بن خطاب،ان کے آزاد کردہ غلام اسلم،انس بن مالک، براابن عازب، جابر بن عبداللہ،جبیر بن نفیر،حذیفہ بن یمان،زید بن ارقم،زید بن ثابت،عبداللہ بن زبیر،عبداللہ بن عباس،عبداللہ بن عمر،عبداللہ بن عمرو،عبداللہ بن مسعود،عثمان بن عفان،عقبہ بن عامر،معقل بن یسار،عبدالرحمان بن ابوبکر،علی بن ابوطالب،ابوامامہ باہلی،ابوسعید خدری،ابوموسیٰ اشعری،ابوبرزہ اورابوہریرہ شامل ہیں۔

ابوبکر کے عمال: مکہ: عتاب بن اسید۔ طائف: عثمان بن ابوالعاص۔صنعا: مہاجر بن امیہ۔عمان: حذیفہ بن محصن۔حضر موت: زیاد بن لبید۔خولان: یعلیٰ بن منبہ۔زبید: ابوموسیٰ اشعری۔جند: معاذ بن جبل۔بحرین: علا بن حضرمی۔نجران: جریر بن عبداللہ۔دومۃ الجندل: عیاض بن غنم۔عراق: مثنیٰ بن حارثہ۔مزنیہ: جرش۔

آخر میں ایک اہم الزام کا جواب دینا ضروری ہے جو ابوبکر پر لگایا جاتا ہے۔کیا ابوبکر نے سیدہ فاطمۃ الزہرا کو میراث سے اور حضرت علی کو خلافت سے محروم کر دیا تھا؟ جس طرح فاطمہ رضی اللہ عنہا پیغمبر علیہ السلام کی وارث تھیں اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کی وراثت میں حصہ رکھتی تھیں۔ابوبکر نے دونوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا، اس لیے کہ شریعت اسلامی میں انبیا کی وراثت جائز نہیں۔یعقوبی کا بیان ہے: جب سیدہ عائشہ نے اعتراض کیا کہ آپ تو اپنے باپ کی وراثت حاصل کر سکتے ہیں اور میں نہیں کر سکتی تو ابوبکر زاروقطار رونے لگے گویا اس اعتراض پر محض ہمدردی ہی کی جا سکتی تھی۔خلافت علی کے بارے میں اگر کوئی واضح ارشاد نبوی ابوبکر کے سامنے آتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتے اور فرمان رسالت پر بے چون و چرا عمل کرتے، اس لیے کہ ان کی پوری زندگی امتثال امر سے عبارت ہے۔پھر ابوبکر کے ہاتھ پر علی مرتضیٰ کا بیعت کر لینا ثابت کرتا ہے کہ وہ وصی رسول نہ تھے۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)،تاریخ ابن خلدون،الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)،تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)،تاریخ الیعقوبی،الصدیق ابوبکر (محمد حسین ہیکل)،عبقریۃ الصدیق (عباس محمود العقاد)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)،سیرت الصدیق (حبیب الرحمان شروانی)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net